امرتا پریتم



ایک سوال

کچھ یادیں، گزرے وقتوں کی!

غالباً ہی نہیں بلکہ پورے وثوق اور یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ برصغیر میں پہلی مرتبہ بلند معیار اور اعلیٰ پائے کی ادبی تصنیفات کی باقاعدہ اشاعت کا آغاز پنجاب بک ڈپو کے زیرِ اہتمام ہوا۔

پنجاب بک ڈپو کے مالک چودھری برکت علی مرحوم علم و ادب کے بے انتہا دلدادہ تھے اور اچھے لکھنے والوں کے ساتھ بڑی فیاضی اور دریا دلی سے پیش آتے تھے۔ اچھی کتابوں کی تلاش میں دُور دراز کا سفر بھی دلی شغف سے کیا کرتے تھے اور پسندیدہ اور مطلوبہ کتابوں کو کسی بھی معاوضے پر حاصل کرا لاتے تھے

• فلاح و بہبود کے کاموں میں اُن کی ذات ایک ضخیم ادارے کی حیثیت رکھتی تھی۔ مفید اور کارآمد قومی تحریکوں کے کارکن اور رضا کار جب بھی اُن کے پاس چندہ حاصل کرنے کے لیے آتے تھے تو وہ بڑی فراخدلی سے اُن کو اپنے عطیات سے نوازتے تھے۔ کتنے ہی سکول ان کی باقاعدہ مالی امداد سے چل رہے تھے۔ کتنے ہی نادار بچوں کی پڑھائی کے مصارف کی ذمہ داری اُن پر تھی اور کتنی ہی بے سہارا بیواؤں کی بسر اوقات کا دار و مدار اُن کے وظیفوں پر تھا یہی وجہ ہے کہ اُن کی وفات دکھی اور بے سہارا لوگوں کے لیے ایک شدید المیہ کی حیثیت رکھتی تھی۔

اُن کی وفات کے بعد اُن کے صاحبزادے چودھری محمد خالد نے بڑی سلیقہ مندی سے اپنے لائق باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے چودھری اکیڈمی کا سنگِ بنیاد رکھا ہے۔

میرا پہلا مجموعہ "خرابات" بھی اسی ادارے نے شائع کیا تھا۔

سید عبدالحمید عدم

ایک سوال

امرتا پریتم

چودھری اکیڈمی لاہور

۳۰۵۔ ذوالقرنین چیمبرز، گنپت روڈ۔ انارکلی،

درِ جمیل پہ سورج برات لے آیا
کوئی کرن بھی قدم اُٹھکر اُسکے لے نہ سکی
ہمارے عشق نے سادہ سا اک سوال کیا
کہ جس کا ساری خدائی جواب دے نہ سکی

ناشر ——— محمد خالد چودھری
اہتمام ——— میاں محمد اسلم
طابع ——— نیازی پرنٹنگ پریس
قیمت ——— نو روپے

چودھری اکیڈمی ۔ لاہور

یہ سوال اس کے لیے ہے جس نے مجھ سے کہا تھا
—— مجھے سرتاپا جواب بنالو ——

دیباچہ

پورے گیارہ سال کی نہیں تھی جب ماں فوت ہوئی۔ ماں کی زندگی کا آخری دن چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کے ساتھ میری یاد میں محفوظ ہے "ایک سوال" ناول میں ناول کا ہیرو جگدیپ مرتی ماں کے بستر کے پاس جس طرح کھڑا ہے، اسی طرح میں اپنی مرتی ماں کے بستر کے پاس کھڑی تھی اور میں نے جگدیپ کی مانند دل اور ذہن کی یکسوئی کے ساتھ خدا سے کہا تھا "میری ماں کو نہ مارنا" اور مجھے بھی اس کی طرح یقین ہوگیا تھا کہ اب میری ماں نہیں مرے گی کیونکہ خدا بچوں کا کہا نہیں ٹالتا ... لیکن ماں مرگئی تھی اور میرا بھی جگدیپ کی طرح خدا پر سے اعتقاد اٹھ گیا تھا۔

اور جس طرح جگدیپ اس ناول میں ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی اور ایک طاق پر رکھی ہوئی دو سوکھی روٹیوں کو اپنے پاس سنبھال کر رکھ لیتا ہے "ان روٹیوں کو تھوڑا تھوڑا کرکے کئی دن کھاؤں گا" اسی طرح میں نے ان سوکھی روٹیوں کو پیس کر ایک شیشی میں ڈال لیا تھا۔

۱۵ مئی ۱۹۷۳ء کو جب دہلی یونیورسٹی نے آنریری ڈی۔لٹ کی ڈگری عطا کی تو گھر آنے پر دیویندر نے اپنی جیب میں کچھ چھپا کر کہا "دیدی آج کوئی من آئی کرنے کو جی چاہتا ہے ناراض نہ ہونا" جواب میں ہنس پڑی تھی "ارے، تیری من آئی جو بھی ہوگی اچھی ہوگی" اور دیویندر نے جیب سے ایک ریشمی رومال،

مصری اور اکیس روپے نکال کر کہا "دیدی! آپ کا کوئی باپ یا بھائی ہوتا۔ کوئی شگن کرتا۔ یہ شگن ان کی طرف سے۔" آنکھیں بھر بھر آئیں اور یاد آیا "ایک سوال" ناول میں جب ناول کا ہیرو اپنے باپ کی موت کے بعد اپنی بھرپور جوان سوتیلی ماں کی اپنے ہاتھ سے اس کی من چاہی شادی کرتا ہے۔ اور وہ پُر شباب لڑکی تھالی میں روٹی پروس کر کہتی ہے۔ "آؤ ماں بیٹا مل کر کھائیں۔" تو وہ روٹی کا پہلا لقمہ توڑتے ہوئے کہتا ہے۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ تم میری ماں لگتی ہو، بہن لگتی ہو یا میری بیٹی لگتی ہو؟" تب ناول کا یہ حصہ لکھتے ہوئے دیویندر میرے سامنے نہیں تھا لیکن چودہ سال بعد جب دیویندر نے وہ رومال وہ مصری اور وہ روپے میری جھولی میں ڈالے تو میرے دل میں آیا بول بعینہٖ وہی تھا "ارے، پہلے یہ بتا: تو میرا باپ لگتا ہے یا میرا بھائی کہ میرا بیٹا؟"

نئی دلی امرتا پریتم

"اٹھ دیپ"!

"دیپ اٹھو ——— میری طبیعت اچھی نہیں ہے ———"

جگدیپ ماں کی آواز سن کر چونک پڑا ——— ماں اس کے ماتھے پر نرم نرم ہاتھ پھیر رہی تھی اور اس کے چہرے کا رنگ زرد پڑا ہوا تھا، دس برس کا جگدیپ آنکھیں ملتا ہوا ماں سے لپٹ گیا۔

"آہستہ میرے چاند ——— آہستہ ——— مجھے سخت درد ہو رہا ہے ———" ماں نے چارپائی کی پٹی کو مضبوطی سے پکڑ لیا ——— "نہ جانے پھر کبھی میں اپنے ہاتھوں سے تجھے کچھ کھلا سکوں گی کہ نہیں ——— جا میرے سورج کنوئیں پر ایک ڈبکی لگا کر میرے پاس آجا ———"

ماں کپکپاتی ہوئی چارپائی کی پٹی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر دالان میں پڑی ہوئی پیڑھی پر بیٹھ کر چھاچھ بلونے لگی۔

جگدیپ کنوئیں تک گیا اور الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ ماں کے قریب آکر بولا ———

"تیری طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ماں تو چچی سے چھاچھ بلونے کے لیے کہہ دے۔"

"چچی ہی سے کہوں گی میرے چاند ——— ذرا ایک گھونٹ یہ اودھ بلوئی چھاچھ پی لے۔"

پچھلے تین روز سے ماں کے بدن میں ایک درد اٹھ کھڑا ہوا تھا ——— گاؤں کے

حکیم نے پہلے تو حٹر کا مربہ دیا۔ پھر دودھ میں ایک پڑیا گھول کر دی اور اب کل رات کو حکیم کہہ گیا تھا — "شہر سے ڈاکٹر بلوا لو — یہ تو کوئی غیبی مرض معلوم ہوتا ہے۔"

"ماں قربان جائے — یہ گھونٹ بھی پی لے۔" ماں نے پھر کہا اور دیپ نے کٹورے میں باقی چند قطرے بھی حلق میں انڈیل لیے۔

ماں سچ کہتی تھی! اس گھڑی کے بعد وہ پیڑھی پر نہ بیٹھ سکی — چارپائی پر سے اٹھنا اب اس کے بس کی بات نہیں تھی — دوپہر ہوئی تو دیپ کا والد گھوڑی پر سوار ہوا اور شہر سے ڈاکٹر کو اپنے ساتھ لے آیا — شہر ان کے گاؤں سے کوئی تین کوس کے فاصلہ پر واقع تھا۔

"مجھے ایسا شک ہو رہا ہے کہ ان کے پیٹ میں رسولی ہے آپریشن کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں —" ڈاکٹر نے آدھ گھنٹہ کے معائنہ کے بعد کہا۔

"میں شہروں میں خوار ہو کر نہیں مروں گی — میں کہیں نہیں جاؤں گی — مروں گی تو اپنے گھر میں مروں گی — دیپ کی ماں نے یہی ایک رٹ لگانی شروع کر دی۔

"بہت اچھا آج دوا دیکر دیکھ لیتے ہیں — مجھے کل صبح ہی دوبارہ مطلع کر دینا۔"

ڈاکٹر نے انجکشن لگایا — دوا دی اور واپس چلا گیا۔

دو گھنٹے تک ماں پُرسکون رہی — دیپ صبح ہی سے ماں کی چارپائی کے پاس جم کر بیٹھا تھا — چچی نے اس سے — "جا بیٹا جا کر کھیل — ماں کا بال بیکا نہیں ہوگا۔"

چچی دراصل دیپ کی موسی تھی۔ دونوں بہنوں کا ایک ہی گھر میں بیاہ ہوا تھا — دونوں بھائیوں سے بیاہی گئی تھیں۔ اگرچہ لوگ اسے دیپ کی چچی کہتے تھے۔ مگر وہ دل موسی کا رکھتی تھی دیپ نے بڑے غور سے چچی کی طرف دیکھا۔ چچی کے چہرے پر گھبراہٹ کی علامت نہیں تھی دیپ نے اطمینان کا سانس لیا اور کھیلنے کے لیے باہر چلا گیا۔

شام کو دیپ نے جب گھر کی دہلیز میں قدم رکھا تو ماں کی چیخیں باہر دالان میں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ دیپ ماں کی چارپائی کی طرف لپکا۔ چچی توے پر روئی گرم کر کے ماں کو سینک پہنچا رہی تھی اور اس کا والد دوا کی خوراک کٹوری میں ڈال کر ماں کی طرف بڑھا رہا تھا۔

دیپ وہیں کا وہیں دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا —— ماں آدھ گھنٹہ تک چیخوں کے ساتھ زور آزمائی کرتی رہی —— پھر آہستہ آہستہ درد ٹھنڈا پڑتا گیا اور جب دوبارہ ماں کے دم میں دم آیا تو کمرے میں مسلط اندھیرے کو ماں نے ٹٹولتے ہوئے پوچھا "میرا دیپ کہاں ہے —؟"

"یہ کیا بے حس و حرکت کھڑا ہے" چچی نے دیپ کا بازو پکڑ کر اسے ماں کی چارپائی کے قریب کر دیا۔

"میرے کنول کے پھول — تو روتا کیوں ہے —؟ پاگل کہیں کا — اچھا کھایا بھی ہے کہ نہیں —— چاچی سے کچھ لیکر کھا لے"۔

ماں کے انگ انگ پر دوا اپنا اثر کر رہی تھی —— پھر نصف سے زائد رات سوتے سوئے گزر گئی۔

صبح کا پہلو پہر ایک بار پھر ماں کی چیخوں سے طلوع ہوا۔ ایک گھنٹہ درد یوں ہوتا رہا جیسے کوئی سوئیاں چبھو رہا ہو اور اس کے بعد ایک بار پھر دوا نے ماں پر غنودگی طاری کر دی اور وہ غفلت کی نیند سو گئی۔

اگلے دن دو پہر کو ماں نے دیپ کو اپنے پاس بلا کر کہا — "جا۔ نوراں کی ماں کو بلا لیا —— کہنا ذرا ایک کے آئے —"

نوراں کا گھر دور نہیں تھا —— دیپ الٹے پاؤں لوٹ آیا — اس کے پیچھے

پیچھے نوراں کی ماں آگئی ــــ اس کے ساتھ ساتھ سات آٹھ برس کی نوراں دوڑتی آرہی تھی۔

"میں تو ابھی ابھی نوراں کے ننھیال سے آرہی ہوں ــــ آتے ہی سنا کہ سیٹھانی بیمار ہے ــــ اتنے میں دیپ پہنچ گیا۔۔ کہتے ہیں شہر سے ڈاکٹر بھی آیا تھا۔ اے خدا ہماری شاہنی پر کوئی آنچ نہ آئے ــــ" نوراں کی ماں کو سوجھ نہیں رہا تھا کہ وہ اور کیا کچھ کہے ــــ اس کا گلا بھر آیا۔

"بیگم ــــ اس دم کا کیا بھروسہ ــــ ابھی سانس آتا ہے اور ابھی کچھ خبر نہیں رہتی ــــ مجھے تیری امانت لوٹانا ہے ــــ" دیپ کی ماں نے بیگم کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی چارپائی پر بٹھا لیا۔

"کیسی امانت شاہنی ــــ؟ تجھے خدا سلامت رکھے ــــ!"

"پھر بھی بیگم ــــ نہ کوئی لکھت نہ پڑھت ــــ"

"ہمارے لیے شاہنی ــــ تو ہے تو جہان ہے ــــ"

"دیپ، ذرا ادھر آ ــــ یہ لے چابی ــــ پچھلے کمرے میں لوہے کا صندوق کھول کر لکڑی کا ڈبہ نکال کر لے آ ــــ"

بیگم روکتی رہی لیکن ماں نے چابی دیپ کے ہاتھ میں تھما دی اور وہ صندوق میں سے ڈبہ نکال کر لے آیا ــــ ماں نے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے ڈبہ کھولا ــــ

"یہ رہی تیری امانت بیگم ــــ"

"تیرے سوا ہمارا کون ہے شاہنی ــــ" بیگم نے دوپٹے کے کنارے سے اپنی آنکھیں پونچھ لیں اور کہا ــــ "تو اچھی بھلی ہے شاہنی ــــ میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لے جاؤں گی۔ مجھے اللہ پر بھروسہ ہے ــــ"

"نہیں بیگم ــــ میں زندہ رہی تو ــــ" ماں کے پھر درد اٹھا ــــ زیورات کی پوٹلی بیگم کے ہاتھ میں دیتے ہوئے اس نے کہا ــــ "اپنی چیزیں گن کر پوری کر لے۔ اور دیپ تو جا کر صندوق بند کر دے۔"

دیپ نے واپس آ کر ماں کو جب چابی لوٹائی تو درد کے مارے اچھل اچھل پڑ رہی تھی۔

"میں نے دیپ کی بہو کے لیے ستاروں کا جڑا ہوا دوپٹہ رکھا ہوا تھا اور چاندی کے گھنگھروؤں والی پازیب ــــ لیکن دیپ کی بہو کا منہ دیکھنا شاید میرے نصیب میں نہیں تھا ــــ میرے دیپ کی جھلمل کرتی ہوئی بہو ــــ چھم چھم کرتی ہوئی میرے دیپ کی دلہن ــــ میرے ایسے نصیب کہاں تھے ـ!

ماں کی چیخیں بڑھتی گئیں۔ اور آہ وزاری میں اضافہ ہوتا گیا۔

"میں دنیا کی چیز سنبھال کر رکھتی تھی بیگم ــــ آج اپنی چیز دنیا کو دیے جا رہی ہوں ــــ میری امانت ــــ میرا دیپ!" ماں کا دل اس کے ہونٹوں پر تڑپ رہا تھا۔

جگدیپ کا والد گھوڑی پر سے اترا۔ ڈاکٹر اس کے ساتھ تھا۔ پندرہ پندرہ منٹ کے وقفہ کے بعد ماں کے دو انجکشن لگائے گئے تو ماں کی چیخیں دھیمی پڑ گئیں اور اس کے بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔

"رویا نہیں کرتے میرے چاند ــــ" چچی نے قریب آ کر جگدیپ کو پیار دیا۔ اور کہا ــــ "بھگوان کا نام لو ــــ شاید اسے ترس آ جائے ــــ بچوں کا کہا وہ کبھی بھی نہیں ٹالتا ــــ"

"آ میرے چاند ــــ باہر چل ــــ شانتی کی آنکھ لگ گئی ہے ــــ شاید تھوڑی دیر کے لیے آرام سے لیٹی رہے ــــ" بیگماں نے جگدیپ کا بازو پکڑ لیا ــــ دیپ وہیں کا وہیں کھڑا رہا ــــ جیسے وہ دھرتی اسے حرکت نہیں کرنے دے رہی تھی۔

باہر دلان میں دیپ کے والد نے ڈاکٹر کے لیے چارپائی بچھادی تھی انہوں نے آج کی رات ڈاکٹر کو اپنے گاؤں میں قیام کرنے کے لیے کہہ رکھا تھا۔ ڈاکٹر نے باقی عورتوں کو بھی حکم دیا کہ وہ کمرے سے باہر آجائیں۔

"لڑکا ابھی نوخیز ہے ــــ کہیں غم دل کو نہ لگا بیٹھے ــــ اس سے کہہ دو کہ باہر جاکر کھیلے ــــ" بیگم بولی۔

چچی نے بڑی منت سماجت کی لیکن جگدیپ نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ جگدیپ کے کانوں میں ابھی تک چچی کے وہ الفاظ گونج رہے تھے ــــ "بھگوان کا نام لو ــــ شاید اسے ترس آجائے ــــ بچوں کا کہا وہ کبھی نہیں ٹالتا ــــ" اور جگدیپ نے سوچا کہ وہ ایک ہی جگہ کھڑا رہ کر بھگوان کے آگے گڑگڑاتا رہے گا۔

شام کا دھندلکا پھیل گیا ــــ چچی نے کمرے میں دیا جلادیا ــــ جگدیپ وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔

"لڑکے کو کچھ ہو نہ جائے ــــ پتھر کی مورت بن کر کھڑا ہے ــــ" چچی نے باہر جاکر کہا۔

"میری تو ایک نہیں سنتا ــــ واسطے دیتے دیتے ہار چکی ہوں۔ صبح سے پانی کا ایک گھونٹ تک نہیں پیا ــــ" چچی نے دوبارہ کہا۔

ماں بدستور بے ہوش پڑی ہوئی تھی ــــ جگدیپ ویسے کا ویسا دریچے کی آڑ میں کھڑا ہوا تھا۔

پھر جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا کہ ایک ننھا سا ہاتھ اسے کھینچ رہا ہے ــــ دونوں آنکھیں بند کرکے وہ بیخودی کے عالم میں گم تھا ــــ اسے یوں لگا جیسے بھگوان اسے مل گیا

ہو — ہر بڑا کراس نے آنکھیں کھولدیں — فوراً اسکا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر کی طرف کھینچ رہی تھی بیگماں چلی گئی — مزاج پُرسی کے لیے آئے ہوئے دوسرے لوگ بھی چلے گئے۔ چچی نے تنور میں روٹیاں لگائیں — کسی نے آدھی کھائی اور کسی نے صرف ایک نوالہ ہی توڑا۔ چچی نے کمرے میں آکر کہا — "بہن کا سانس اکھڑا ہوا ہے۔"

سب طرف کھلبلی مچی ہوئی تھی — لیکن چیخوں کی آواز اب نہیں آ رہی تھی۔ جگدیپ کو یوں محسوس ہوا — "یہ سب یونہی گھبرا رہے ہیں — ماں کے اب درد نہیں ہو رہا۔ میں بھگوان کے آگے بہت گڑگڑایا ہوں — وہ بچوں کا کہا کبھی نہیں ٹال سکتا —"

نہ درد اٹھا نہ چیخوں کی آواز آئی — رات لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ جگدیپ حیران تھا کہ ماں کے درد نہیں ہو رہا۔ لیکن یہ ماجرا کیا ہے کہ نہ تو ڈاکٹر سوتا ہے اور نہ گھر والے سوتے ہیں۔ چچی کی ایک بار پھر آواز آئی — "کوئی کوئی سانس آ رہا ہے۔"

اس کے بعد سارے گھر کی چیخوں نے رات کا سینہ چیر کر رکھ دیا — جگدیپ نے دیکھا کہ ہر کوئی چیخ رہا ہے اور ان کی چیخوں میں ماں کی چیخ سنائی نہیں دے رہی۔

ایک ہفتہ ہو گیا تھا — ماں کی چیخوں پر سب ہی گھبرا اٹھتے تھے۔ آج ماں کی چیخیں بند ہو چکی تھیں مگر گھر والوں کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔

"میرے بچے —" چچی نے قریب آکر جگدیپ کو چھاتی سے لگا لیا — "اب ماں ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملے گی —"

جگدیپ کی دونوں مٹھیاں بھنچی رہیں — بھگوان کسی کی نہیں سنتا — بچوں کی بھی نہیں سنتا۔

گھر کے افرادیوں لیٹے ہوئے تھے جیسے سیپیوں نے اپنے بطن کا موتی کہیں گم کر دیا ہو اور اب چھلکوں کی طرح دھرتی پر بکھری پڑی ہوں۔

گاؤں کا رواج تھا کہ جب کسی گھر کا کوئی فرد انتقال کر جاتا تھا تو اس گھر میں کچھ پکتا نہیں تھا ــــ گھر کی بہوؤں کے میکے والے اس دن کی روٹی بھیج دیتے تھے۔ جسے کچھ کھانا ہوتا کھا لیتا۔

دیپ کی چچی جب چوکے میں روٹی پروسنے کے لیے گئی تو اس کی نظر طاق پر پڑی۔

بہن کے ہاتھ کی پکی ہوئی دو روٹیاں ــــ !"

ایک ہفتہ ہو گیا ہے جب بہن نے آخری بار تنور میں روٹیاں لگائی تھیں۔ یہ دو روٹیاں بچ گئی تھیں ــــ اٹھا کر طاق میں رکھ دی تھیں۔ کہ صبح جانوروں کے آگے ڈال دوں گی ــــ اس کے بعد کچھ ایسی بھگدڑ مچی کہ کسی کو کچھ ہوش نہ رہا۔ یہ روٹیاں وہیں کی وہیں پڑی رہیں ــــ سوکھ کر لکڑی ہو گئی ہیں ــــ آدمی کہیں چلے جاتے ہیں مگر چیزیں پڑی رہتی ہیں۔"

جگدیپ نے چچی کی آواز سنی تو وہ طاق کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

میرے بیٹے کا چہرہ تو دیکھو کیسا اتر گیا ہے ــــ آئیں تجھے روٹی پروس دوں۔"

چچی نے کہا اور تھالی میں روٹی ڈال دی ۔۔۔ چوکے میں دیپ کے لیے مونڈھا بچھا دیا

”میرے لال روٹی کیوں نہیں کھاتا“ ۔۔۔ چچی نے دیپ کو خاموش بیٹھا دیکھ کہا ۔

”کھاؤں گا ۔۔۔ تو جا ۔۔۔“

چچی سب کے لیے تھالی میں روٹی ڈالتی رہی اور باہر دلان میں سب کے آگے رکھتی گئی ۔

سب اپنے اپنے دھیان میں مگن تھے ۔ دیپ نے سامنے رکھی ہوئی تھالی کو ابھی تک چھوا بھی نہیں تھا ۔۔۔ پھر دیپ نے دیکھا کہ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا ۔۔۔ وہ چپکے سے اٹھا اور اس نے طاق میں سے دونوں روٹیاں اٹھا کر اپنے کرتے کے نیچے چھپا لیں اور دلان سے گزر کر باہر کی گلی میں ہو لیا ۔

گاؤں کے باہر بیری کا بہت بڑا پیڑ تھا ۔ دیپ کو جیسے وہاں پہنچنے کی بہت جلدی تھی ۔۔۔ اس نے کرتے کے اوپر بازو رکھ کر ان دونوں روٹیوں کو مضبوطی سے اپنے سینے کے ساتھ لگایا ہوا تھا ۔۔۔ وہ بیری تلے پہنچ گیا ۔

اس نے دونوں روٹیاں کرتے کے نیچے سے نکال لیں اور بیری کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا ۔۔۔ تاریکی بہت گہری تھی ۔۔۔ دیپ روٹیوں کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ اندھیرے میں اسے روٹیوں پر پڑے ہوئے پھول بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر وہ دیکھتا رہا ۔۔۔ دیکھتا رہا ۔۔۔

پھر دیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے شام نہیں تھی دوپہر تھی اور وہ لڑکوں کے ساتھ مل کر بیری پر سے بیر توڑ رہا تھا ۔۔۔ بیر توڑ توڑ کر اس نے لڑکوں کی جھولیاں بھر دیں ۔۔۔

اور بیر چُن چُن کر اس نے اپنی جھولی بھر لی۔

ماں کی آواز سنائی دی ۔ صبح کا گھر سے بھوکا پیاسا نکلا ہوا ہے۔ میرا کنول کا پھول ۔ چہرہ کتنا مرجھا گیا ہے ۔ ماں تجھ پر نثار ہو جائے کیا تجھے روٹی نہیں کھانی تھی ۔ ؟" اس کے بعد ماں نے اس کو باقی لڑکوں سے الگ کر کے بیری کے نیچے بٹھا لیا۔ اپنا دوپٹہ اتار کر اس کے سر پر ایک اوٹ سی کر دی اور اس اوٹ میں ماں نے مکھن سے چُپڑی ہوئی روٹی اس کے آگے رکھ دی۔

دیپ نے دانتوں سے روٹی توڑی ۔ روٹی مکھن کی طرح اس کے منہ میں گھل جایا کرتی تھی ۔ آج نہ جانے کیا ہوا تھا۔ روٹی لکڑی کے ٹکڑے کی طرح اس کے منہ میں چُبھنے لگی۔

اوٹ کو ہاتھ سے پرے ہٹا کر دیپ نے ماں سے پوچھنا چاہا۔

"میں ہوں دیپ ۔؟" نوراں کا دوپٹہ ڈھلک کر دیپ کے منہ پر آپڑا تھا۔

نوراں نے اپنا دوپٹہ کھینچتے ہوئے کہا:

"تو ۔ ؟"

"ہاں ۔ میں نوراں ہوں ۔"

"ماں کہاں ہے؟"

". . . . . . ."

نوراں خاموش رہی اور پھر بولی۔

"تو رو رہا ہے ۔ ۔ ؟"

"نہیں تو ۔"

"رو تو رہا ہے ——"

"ماں کہاں ہے —؟"

". . . . . . ."

نوراں پھر خاموش رہی ——

"تو کہاں سے آئی ہے —؟"

"میں نے تجھے ادھر آتے ہوئے دیکھا تھا —— تو اس قدر اندھیرے میں یہاں کیوں آیا ہے ——؟"

"یہاں ابھی ابھی ماں بھی آئی تھی ——"

"یہاں ——؟"

"ہاں . . . میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس لیے میرے سر پہ اوٹ کر دی تھی ——"

"تو پاگل ہو گیا ہے دیپ —"

"نہیں تو ——"

"تیری جھولی میں یہ کیا ہے —؟"

"روٹی —"

"روٹی ؟" نوراں نے ہاتھ لگا کر دیکھا —— واقعی لکڑی کے ٹکڑوں کی طرح سوکھی ہوئی وہ روٹیاں تھیں ۔

"انہیں کہاں سے لایا ہے ——؟"

"گھر سے —— چچی نے کہا تھا یہ روٹیاں ماں کے ہاتھ کی پکی ہوئی ہیں —"

"کیا تو نے آج روٹی نہیں کھائی ــــ؟

"ابھی ابھی ماں نے روٹی دی تھی ــــ کھانے ہی لگا تھا کہ ۔۔۔۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے ۔"

"نہیں تو ــ"

" ماں تو مر گئی ہے ۔"

"میں نے ابھی ماں کو دیکھا تھا ۔"

"یہ تیرا وہم ہے دیپ ــــ یہاں تیری ماں تیرے سر پر اوٹ کر کے تجھے روٹی کھلایا کرتی تھی نا ۔؟"

دیپ نے پھر کچھ نہ کہا ۔

"تو نے آج روٹی نہیں کھائی ہے نا ۔؟"

دیپ خاموش رہا ۔

"مجھے معلوم ہے تو نے کچھ نہیں کھایا ــــ" اور پھر نوراں نے جھجکتے ہوئے کہا ــ "تو میرے ہاتھ سے روٹی کھائے گا ــــ؟ ہمارے گھر کی روٹی ــــ" اور نوراں نے اپنی چنری میں لپٹی ہوئی نرم روٹی نکال لی ــــ "ماں کوٹھے پر ایندھن ٹٹول رہی تھی ۔ میں چپکے سے روٹی نکال کر لے آئی ہوں ۔"

جگدیپ ابھی تک بیری کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا ــــ اس نے منہ اٹھا کر نوراں کی طرف پہلی بار دیکھا ــــ

"تو رو رہا ہے ــــ" اندھیرے میں بھی نوراں کو دیپ کا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ نظر آ گیا اور وہ دیپ کے قریب بیٹھ گئی ــــ پھر اس نے اپنی چنری سے دیپ

کا منہ پونچھا۔

"تھوڑی سی روٹی کھالے ___"

دیپ نے نوالہ توڑ کر منہ میں ڈال لیا۔

"کسی کو بتانا نہیں ورنہ تم بھی پٹو گے میں بھی پٹوں گی ___؟"

"کیوں ___؟"

"ہم مسلمان جو ہیں ___"

"تو پھر کیا ہوا ___؟"

"کہتے ہیں خدا ناراض ہو جاتا ہے ___"

"خدا کوئی چیز نہیں ___" دیپ نے دوسرا نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔

"یوں نہیں کہا کرتے ___"

"کیوں ___؟"

"خدا ناراض ہو جاتا ہے"

"ہوتا ہے تو ہو جائے ___"

"پگلے یوں نہیں کہا کرتے ___"

"میں جانتا ہوں خدا کوئی چیز نہیں ___"

"تجھے کس طرح پتہ ہے ___؟"

"اگر خدا ہوتا تو میری بات نہ سنتا"

"تو نے اس سے کیا کہا تھا ___؟"

"میں نے اسے کہا تھا کہ میری ماں کو مرنے نہ دیتا"

"کیا کبھی تونے اسے دیکھا تھا —؟ وہ دکھائی تھوڑے ہی دیتا ہے۔"

"کیا وہ سنتا بھی نہیں ہے۔"

"کیا خبر —؟"

اس کے بعد وہ دونوں چپ ہو گئے —— ایک ایک نوالہ کر کے دیپ نوراں کی لائی ہوئی ساری روٹی کھا گیا۔

"ان روٹیوں کو کیا کرے گا —؟ نوراں نے دیپ کی جھولی میں پڑی ہوئی دو سوکھی روٹیاں اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"کھاؤں گا۔"

"یہ نہیں کھائی جائیں گی ——"

"ان کو چورا کر کے کھالوں گا ——"

"نہیں دیپ ——"

"پھر کیا کریں —؟"

"انہیں بو دیں ——" نوراں نے سوچنے کے بعد کہا۔

"کیا روٹیاں بھی کبھی اُگا کرتی ہیں نوراں ——؟"

"روٹیاں تو نہیں اُگا کرتیں۔ لیکن ہم ان کے ساتھ بیروں کا بیج ڈال دیں گے یا آم کی گٹھلی —— بیروں یا آموں میں روٹیوں کا رس شامل ہو جائے گا۔"

"بات تو ٹھیک ہے نوراں ——" دیپ جیسے اچھل پڑا اور پھر کہنے لگا۔

"چل اُٹھ پھر ان کو بو دیں ——"

"اس وقت کس طرح بوئیں گے ——!"

"ایک گڑھا کھود لیتے ہیں ۔"

"کھرپا تو ہے ہی نہیں ۔"

"میں اپنے ہاتھوں سے گڑھا کھود دوں گی ۔"

"اپنے پاس تو بیج بھی تو نہیں ہے ۔ آم بھی کوئی نہیں ۔"

"برگد کی ٹہنی توڑ کر لگا لیتے ہیں ۔"

"اس کا پھل کیسے کھائیں گے ۔ ؟"

"نہ سہی ۔ یہ پیڑ بڑا ہو جائے گا تو اس کے نیچے گھنی چھاؤں ہو جائے گی ۔"

"اچھا ۔"

"چل اُٹھ گڑھا کھود یں ۔"

"ہاں چل ۔ برسات شروع ہونے والی ہے ۔ پرسوں ماں کہہ رہی تھی برکھا رت میں بیج ڈالا جائے تو بہت جلد اُگتا ہے ۔ !"

"کون سی جگہ اچھی ہے نوراں ۔ ؟"

"جو جگہ تجھے پسند ہو ۔"

"نہیں جو تجھے پسند ہو ۔"

"دھرم شالہ کے پیچھے بہت سی جگہ خالی پڑی ہے ۔"

"میں وہاں نہیں جاؤں گا ۔ !"

"کیوں ۔ ؟"

"وہاں لوگ بھگوان کا نام لیتے ہیں ۔"

"پھر کیا ہوا ۔ ؟"

"میں اس کا نام نہیں سننا چاہتا۔"

"پھر تو ہی بتا بیج کہاں ڈالیں۔"

"تیرے گھر کے پیچھے بھی تو بہت سی جگہ خالی پڑی ہے۔"

"ہاں ہے تو ——"

"چل —— وہاں چلیں۔"

"چل —— میں روز پانی دے کر اسے سینچا بھی کروں گی۔"

جگدیپ نے برگد کے پیڑ سے وہ شاخ توڑی جس کی گانٹھیں پھوٹ نکلی تھیں نوراں نے دونوں روٹیاں اٹھالیں اور جب وہ دونوں نوراں کے گھر کے پچھواڑے پہنچے تو نوراں نے کہا —— "تو یہیں کھڑا رہ —— میں چھپ کر گھر سے بھرا ہوا پانی ڈول لاتی ہوں ——"

برگد کے ننھے سے پیڑ نے تیسرے، نوراں نے گیارھویں اور جگدیپ نے تیرھویں برس میں قدم رکھ دیا تھا۔

ایک دن دیپ کی چچی سوت اٹیر رہی تھی۔ لوہے کی دو سلائیوں میں ٹنگے ہوئے دو گولے پیتل کی چھلنی میں گیند کی طرح لڑھک رہے تھے اور دونوں کی ڈور اٹیرن پر لپیٹتے ہوئے چچی نے ایک طویل گیت چھیڑ دیا تھا:

کالے کوّے اُڑتا جا،
ڈال ڈال پہ بیٹھتا جا،
اُڑ جا میرے میکے جا،
اک نہ بتانا ماں رانی کو
دیکھ دیکھ گڑیاں روئے گی
اک نہ بتانا میرے پتا کو
چھوڑ کچہری آ جائے گا،
اور چپکے چپکے روئے گا،
اک نہ بتانا میری بہن کو

چرخہ چھوڑ کے اٹھ آئے گی

بلک بلک کر روئے گی ،

اور پھر گیت گاتے ہوئے چچی کا گلا بھر آیا۔ سامنے دیپ اور اس کا اپنا بیٹا ہیرا اسکول سے لوٹ کر اپنے اپنے بستے رکھ رہے تھے۔

"دیپا۔!"

"کیا ہے چچی ۔۔؟"

"روٹی پروس دوں ؟"

"پروس دے چچی !"

جب چچی نے دونوں لڑکوں کے لیے تھالیوں میں روٹی رکھ دی۔ تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

"کیوں چچی کیا تیری طبیعت اچھی نہیں ہے ؟"

"اچھی ہے دیپ"

"نہیں چچی ۔۔۔ کوئی بات ضرور ہے۔"

چچی سسکیاں بھرنے لگی اور دیپ نے روٹی سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"تو روٹی کھا لے پھر بتاؤں گی۔"

"نہیں چچی پہلے بتائے گی تو روٹی کھاؤں گا۔"

"نہیں تو پہلے کھا لے گا تو پھر بتاؤں گی۔"

دیپ نے چچی کا کہنا مان لیا اور روٹی کھالی۔

"اب بتاؤ چچی کیا بات ہے۔؟"

چچی ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اسے اپنی گود میں بٹھا کر بولی۔
"تیرا باپو پچھلے ایک برس سے یہ واسطے دے رہا ہے کہ تو اس کے پاس شہر جا کر پڑھے۔
"ہاں —"
"یہاں تو تین کوس کی مسافت طے کر کے اسکول جاتا ہے — دھوپ میں لوٹتا ہے تو تیرا چہرہ مرجھا جاتا ہے — اب تو کون سی جماعت میں ہے —؟"
"نویں جماعت میں چچی۔"
"تو لاہور جا کر کیوں نہیں پڑھتا کہتے ہیں بہت بڑا شہر ہے — مجھے تو میرے بھائی نے کئی بار وہاں بلوا بھیجا مگر میں نہ جا سکی — شاید میں بھی کبھی تیرے بہانے وہاں جا نکلوں۔"
"اگر تو کہتی ہے چچی تو میں شہر چلا جاتا ہوں — یہ کہہ کر دیپا چچی سے لپٹ گیا — "میں شہر میں چچی سے کیسے ملوں گا۔ مجھے چچی کی طرح روٹی کون کھلائے گا؟"
"مجھے موت آجائے — "چچی کے اندر بیٹھی ہوئی جیسے ماں بول رہی تھی۔ "تو میرے ہاتھ کی پکی ہوئی کب تک کھائے گا —؟"
"کیوں چچی —؟
"سنا ہے —" چچی سے کچھ کہا نہ گیا۔
"کیا سنا ہے چچی —؟"
"سنا ہے تیرے پتا . . . . تیری نئی اماں آجائے گی دیپ —!
"نئی ماں —؟" دیپ بھی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا — اب وہ سمجھدار ہو گیا تھا۔

"دونوں بھائی الگ ہو رہے ہیں دیپ — تیرے پتا کی رسوئی الگ اور ہماری الگ —"

دیپ خاموش رہا۔

"بھائی بھی تو ماں کی طرح ہوتی ہے — اگر تو شہر جا کر پڑھے گا۔ تو آدمی بن جائیگا — ان دیہات میں تو آدمی مٹی سے لڑتا ہے اور مٹی ہو جاتا ہے۔"

"بہت اچھا چچی —"

"ایک بات اور بھی ہے —"

"وہ کیا —؟"

"تیری ماں کے کپڑے میں کسی کو نہیں دوں گی — وہ میری بہن کے کپڑے ہیں —!"

دیپ خاموش رہا۔

"کتنے چاؤ سے اس نے ریشمی اور طلّے دار کپڑوں کا ٹرنک بھرا ہوا تھا — کوئی گوٹے والا — کوئی طلے والا — دوپٹہ تو ستاروں سے جڑا ہوا ہے — کہا کرتی تھی — میں نے دوپٹہ دیپ کی دلہن کے لیے رکھا ہوا ہے — جھلمل کرتی ہوئی میرے دیپ کی بہو — تیرے پتا ایک چھوڑ کر سات عورتیں لے آئیں۔ میں کسی کلموہی کو ہاتھ تک نہیں لگانے دوں گی — تیرے چچا سے کہہ کر صندوق کی چابی میں نے اپنے پاس رکھ لی ہے — یہ رہی وہ چابی — اسے سنبھال کر رکھ لے دیپ!"

"میں اسے کیا کروں گا چچی — تو ہی رکھ لے۔"

"یہ تیری امانت ہے دیپ۔" اتنا کہہ کر چچی نے اس کی پیشانی چوم لی — اسی رات کو دیپ کے چچا نے اپنے بھائی سے بات کر کے لاہور میں دیپ کے ماموں کو خط

لکھ دیا۔ دیپ نے اپنے کپڑے اور اپنی کتابیں حفاظت سے رکھ دیں اور اس کے والد نے اسے دو نئی قمیضیں اور دو نئے پاجامے سلوا دیئے۔

دوسرے دن رات کو دیپ نے ایک خواب دیکھا ــــ اس نے اور نوراں نے مل کر برگد کا جو پیڑ لگایا تھا۔ اب وہ بلند قامت ہو گیا تھا۔ اس کے پتے نرم اور گھنے تھے ــ اس کے چھتنارے میں کہیں بھی کوئی خلا نہیں تھا۔

دیپ برگد کے نیچے بیٹھا ہوا تھا اور پھر چھم چھا چھم کرتے ہوئے کسی کے قدموں کی آواز آنے لگی ــــ دیپ نے چونک کر دیکھا۔

ایک پری اس کے سامنے کھڑی تھی ــــ اس کی آنکھیں چندھیا گئیں ــــ پری نے سلمے ستارے سے جڑا ہوا لباس پہن رکھا تھا اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"تجھے سانپ سونگھ جائے ــــ کیا تو نوراں ہے ــ؟"

"کیا تو ڈر گیا تھا دیپ ــ؟"

"ہاں ــــ تو پری بن کر کیوں آئی تھی ــ؟"

"میری مرضی"

نوراں کی ہنسی سے دیپ کی آنکھ کھل گئی ــــ اور دیپ نے دیکھا نہ وہاں برگد کا پیڑ تھا، نہ نوراں اور نہ ہی وہاں تاروں جڑا لباس تھا ــــ وہ دالان میں اپنی چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔

شام کو دیکھ نوراں کے گھر گیا۔ چچی بیگماں سے ملا۔ نوراں سے ملا۔ اور پھر وہ دونوں بالٹی میں پانی ڈال کر اپنے برگد کو پانی دینے لگے۔

"تو شہر کیوں جا رہا ہے دیپ ــ؟"

"وہاں پڑھوں گا ۔"

"تو بہت پڑھ جائے گا دیپ تو ہم سے بات بھی نہیں کرے گا ۔"

"کیوں ۔؟"

"تجھے ہماری باتیں پسند نہیں آئیں گی ۔۔۔" نوراں نے ابرق لگا کر اپنا دوپٹہ رنگا ہوا تھا ۔۔۔ دیپا نے اس کا دوپٹہ مروڑ کر بہت سا ابرق جھاڑ دیا ۔۔۔!

"نوراں ۔؟"

"میرے دوپٹے کا سارا ابرق اتار دیا تو نے ۔۔۔"

"میں نے سوچا تھا کہ تیرے دوپٹے میں تارے جڑے ہوتے ہیں ۔"

"ہاں تجھے دن کو بھی تارے دکھائی دیتے ہیں ۔"

دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے ۔

"کیا تو برگد کو یونہی سینچتی رہے گی ۔؟"

"تجھے کیا ۔ سینچوں یا نہ سینچوں ۔؟"

"اچھا ۔ میری بلا سے ۔۔۔"

"تو شہر جا ۔۔۔ تجھے گاؤں کے برگد سے کیا واسطہ ۔۔۔ یہ سوکھ جائے یا جل جائے ۔۔۔ تجھے اس سے کیا غرض ۔؟"

نوراں کے معصوم ہونٹوں پر یہ جوانی کا پہلا طعنہ تھا ۔

دوسرے دن صبح کو دیپ اپنے ماموں کے ساتھ شہر چلا گیا ۔

جگدیپ کو اس کے ماموں نے نویں جماعت میں داخل کروا دیا۔ اسکول میں پہلا دن عمر بھر کے لیے اس کے دل پر ایک گہری خراش ڈال گیا۔

اس کی جماعت کے لڑکے آپس میں کھسر پھسر کرتے، جگدیپ کی طرف دیکھتے اور پھر قہقہے بلند کرتے ـــــ لڑکوں کی نگاہیں جگدیپ کو اپنے چہرے پر کانٹوں کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں ـــــ دو تین گھنٹے گزر گئے جگدیپ کے دل میں یہ خواہش کسمسا رہی تھی کہ وہ اسکول سے بھاگ جائے، شہر سے بھاگ جائے اور کہیں دور نکل جائے۔

ڈرائنگ کے پیریڈ میں جب آدھ گھنٹہ صرف کر کے اُن لڑکوں نے اپنی اپنی کاپیاں ماسٹر کے حوالے کیں تو ماسٹر جی نے کاپیاں دیکھ دیکھ کر جگدیپ کی کاپی الگ رکھ لی ـــــ اور پھر جگدیپ کو اپنے پاس بلا کر اس کی پیٹھ پر تھپکی دی ـــــ لڑکوں نے ہونٹوں پر آئی ہوئی ہنسی دبا کر رہ گئی ـــــ صبح سے جگدیپ کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔

ڈرائنگ کا پیریڈ ختم ہو گیا ـــــ لڑکے کمرے سے باہر آئے تو پھر کھسر پھسر شروع ہوئی اور جگدیپ کو ایک بار پھر لڑکوں کی نگاہیں اپنے چہرے پہ کانٹوں کی طرح چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

دوسرے دن ڈرائنگ کے پیریڈ میں ماسٹر جی نے جگدیپ کی کاپی بورڈ پر لٹکا دی اور لڑکوں کو دکھلائی ـــــ لڑکوں کی ہنسی کل کی طرح ایک لمحہ کے لیے پھر دب گئی ـــــ جگدیپ نے پھر اطمینان کا سانس لیا۔ مگر اب بھی اس کا دل بجھا ہوا تھا۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور وہ تنہائی میں بیٹھ کر

ڈرائنگ کا پیریڈ ختم ہوا تو لڑکے پھر قہقہے چھوڑنے لگے۔

جگدیپ روہانسا سا ہو کر بورڈ کے اوپر سے اپنی کاپی اتارنے لگا۔

لڑکے کمرے سے باہر جا چکے تھے ـــــ ماسٹر جی نے اس کو اپنے پاس بلا لیا۔

"تمہارے ہاتھ میں بڑی صفائی ہے ـــــ اگر میں تمہیں بہت سا کام کرنے کے لیے دوں تو کیا کروگے۔؟"

جگدیپ سے کچھ نہ کہا گیا ـــــ ماسٹر جی کے ان الفاظ نے اس کے درد کو اور بھی چمکا دیا تھا۔

"اگر تم محنت کروگے تو کسی روز مصوّر بن جاؤگے"

جگدیپ کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا ـــــ اس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی ـــــ اس شہر میں سب ہی بیگانے تھے وہ بھول کر اس شہر میں آیا تھا ـــــ لوگ اسے دیکھ کر ہنستے تھے ـــــ صرف ماسٹر ہی ایک ایسا تھا جو اس پر ہنس نہیں رہا تھا۔

ماسٹر جی نے اس کی دلی کیفیت کو بھانپ لیا اور پھر بڑے پیار سے اسے اپنے پاس اسٹول پر بٹھا کر پوچھا ـــــ "شہر میں تمہارا شاید جی نہیں لگا۔؟"

"میں اس اسکول میں نہیں پڑھوں گا ـــــ جگدیپ کے ہونٹ پھڑپھڑانے

لگے ——— "مجھ پر دوسرے لڑکے ہنستے ہیں "

"اچھا ——— میں تمہیں ایک بات بتاؤں ——— کل سے سفید پاجامہ پہن کر آنا ——— یہ دھاری دار پاجامہ نہ پہننا "

اب بھی جگدیپ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ——— وہ اپنے پاجامے کی طرف دیکھنے لگا ——— نیا اور کورا پاجامہ تھا۔

"شہروں میں دھاری دار پاجامہ صرف رات کو سونے سے پہلے پہنتے ہیں، دن کو نہیں پہنتے ——— یہی وجہ ہے کہ لڑکے تمہیں دیکھ کر ہنستے ہیں ——— تمہارا کام سب سے اچھا ہے ——— تم جماعت میں اول آؤ گے ——— پھر دیکھنا "

جگدیپ کے بجھے ہوئے دل میں ایک چنگاری سی سلگ اٹھی ——— اس سے کچھ نہ کہا گیا۔ لیکن جب اس نے ماسٹر جی کی طرف دیکھا تو اس آنکھوں میں اس عہد و پیماں کی جھلک تھی ——— "جتنی محنت آپ کہیں گے میں کروں گا۔

ڈیڑھ برس بیت گیا ـــــ جگدیپ نے دسویں جماعت پاس کرلی۔ اور جب اس کے ماموں نے اسے کالج بھیجنا چاہا تو جگدیپ نے فیصلہ کن انداز میں کہا کہ وہ آرٹ سکول میں داخل ہوگا۔

ماموں کا جی چاہتا تھا کہ ان کے خاندان میں کوئی لڑکا بی اے پاس ہو۔ اسے جگدیپ سے بڑی امیدیں تھیں لیکن جگدیپ کے ارادے نے اس کے حوصلے پست کر دیئے گاؤں سے جگدیپ کے والد کا خط بھی آیا کہ تصویریں بنانا سیکھ کر جگدیپ کے پلّے کیا پڑے گا ـــــ کالج میں پڑھے ـــــ شاید کبھی افسر بن جائے ـــــ ورنہ گاؤں واپس چلا آئے ـــــ اپنی زمین پر کام کرے۔

جگدیپ کے پاس امید کی صرف ایک ہی کرن تھی ـــــ اسکول کا وہ ڈرائنگ ماسٹر ـــــ!

اس کے پاس جا کر جگدیپ نے اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اور اس سے التجا کی کہ وہ اس کے ماموں کو سمجھائے۔

تین دن کی مسلسل بحث اور تکرار کے بعد ماموں بددل ہو کر جگدیپ کو آرٹ اسکول میں لے گیا۔

"لو یہ گولڈ سمتھی ہے سنار کا کام! یہ بلیک سمتھی ہے۔ لوہار کا کام۔ آ! یہ کارپنٹری ہے ـــــ بڑھئی کا کام ـــــ یہ ہے ٹیکسٹائل ڈیزائن ـــــ جیسے ہمارے گاؤں میں کپڑے پر چھاپے کا کام ـــــ اس کا ماموں کہہ رہا تھا۔ جگدیپ مسکرا رہا تھا ـــــ ماموں نے مجسمہ سازی کے شعبے کی طرف جاکر کہا ـــــ" جیسے کمہار برتن بناتا ہو ـــــ دیپ اگر اتنے برس ضائع کر کے بھی لوہار یا بڑھئی ہی بننا ہے تو۔۔۔۔"

"آپ فکر نہ کریں ـــــ میں کمرشل پنٹنگ کا کورس ـــــ کروں گا۔"

"بعد میں لوگوں کے سائن بورڈ ہی بنایا کرے گا۔؟"

اس کا ماموں مایوس ہو چکا تھا ـــــ جگدیپ خاموش رہا ـــــ اور اس نے کمرشل پنٹنگ کے شعبے میں اپنا نام لکھوا دیا۔

گاؤں سے جگدیپ کے والد کے دو تین خطوط آئے۔ جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ اب ان کی صحت گرتی جا رہی ہے اور جگدیپ چھٹیوں میں آ کر ان سے مل جائے چچا کا خط بھی آیا تھا ـــــ اس خط میں اس کی چچی نے لکھوایا تھا ـــــ "کیا تو اتنا ہی سنگدل ہو گیا ہے ـــــ کبھی آ کر منہ نہیں دکھایا"

گذشتہ چھٹیوں میں بھی اس نے سوچا تھا کہ وہ گاؤں جائے گا۔ کئی بار اس نے ارادہ بھی کیا۔ لیکن جب بھی وہ اپنے ٹرنک میں کپڑے ڈالتا تو اس کے دل کو ایک ٹیس اٹھتی ـــــ اس نے سنا تھا کہ اب اس کے گھر کے دالان میں ایک اونچی دیوار اٹھا دی گئی تھی ـــــ ایک طرف چچی رہتی تھی۔ اور دوسری طرف اس کی نئی ماں ! لوگ کہتے تھے کہ اس کا والد دھرم شالہ میں پھیرے لیکر ایک عورت گھر لے آیا تھا جسے سب چھوٹی شاہنی کہتے تھے۔

جگدیپ جب گاڑی میں سوار ہوا تو بڑی دیر تک اسے اپنے گھر کے دلان میں اٹھی ہوئی دیوار دکھائی دیتی رہی ـــــ پھر اس دیوار کی جگہ برگد کے پیڑ لہلہانے لگے ـــــ ریل گاڑی اسے گاؤں کے قریب لیے جا رہی تھی۔

اس نے والد کے قدموں میں سر رکھ دیا ـــــ چچا سے بغلگیر ہوا اور پھر چچی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"تو اب جوان ہو گیا ہے۔!"

"اور تو بہت دُبلی ہو گئی ہے چچی ___؟"

"یہ میری جوانی کے دن تو نہیں ہیں ___"

"ہیرا کہاں ہے -؟"

"ابھی کنوئیں سے آتا ہو گا ___ اس نے بڑا قد نکال لیا ہے ___ تیرے کندھے کے برابر آتا ہے"

"اور چچی ....."

"آ تجھے چھوٹی شاہنی کے پاس لے چلوں ___ باہر نہیں نکلتی ___ تجھ سے ڈرتی ہے"

"مجھ سے -؟"

"ہاں ___ غریب گھر کی لڑکی ہے ___ ڈری ڈری سی رہتی ہے"

جگدیپ کے سینے پر پڑا ہوا بوجھ جیسے چچی نے ہلکا کر دیا ___ اس نے اندر جا کر چھوٹی شاہنی کے پاؤں چھوئے -

"جیتے رہو ___" اور چھوٹی شاہنی نے جھجکتے ہوئے جگدیپ کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرا ___ "کیا تم مجھ سے ناراض ہو ___؟" چھوٹی شاہنی نے دھیمی آواز سے پوچھا -

"نہیں تو ___" دیپ جیسے چونک پڑا -

"تم گاؤں کیوں نہیں آتے تھے ___؟"

"سوچ رہا تھا کہ کچھ پڑھ لوں ___ کچھ سیکھ لوں ___" دیپ نے کہا - مگر وہ حیران تھا اسے اس قسم کے سوال کی توقع نہیں تھی -

"ہیرا کو کوئی قصور نہیں دیپ ___" چھوٹی شاہنی نے پھر آہستہ سے کہا!

"نہیں تو ___" جگدیپ نے ایک بار پھر حیران ہو کر چھوٹی شاہنی کی طرف دیکھا - گزشتہ برس جگدیپ چھوٹی سیٹھانی سے ملنے سے ڈرتا رہا تھا - لیکن آج اس نے

دیکھا کہ چھوٹی شاہنی شاید اس سے بھی زیادہ ڈرتی تھی ۔

جگدیپ نے کھانا کھایا اور پھر دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد اس نے کہا:

"میں ذرا باہر ہو آؤں ۔"

"ابھی تو بہت دھوپ ہے ۔۔۔ تھوڑی دیر بعد جانا ۔۔۔" نئی شاہنی نے پیار سے کہا ۔۔۔ اگر اس کی ماں ہوتی تو وہ شاید اس کا کہا ٹال دیتا لیکن چھوٹی شاہنی کے سامنے اس سے انکار نہ ہوا اور وہ چارپائی پر لیٹا رہا ۔

"مجھے یاد ہی نہیں رہا ۔۔۔ نوراں دو بار آ چکی ہے ۔۔۔ تم سوئے پڑے تھے !"

"نوراں ۔۔۔؟"

"کیوں کیا یاد نہیں رہا ۔۔۔ کہتے ہیں بچپن میں تو اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا ۔!"

"نوراں آئی تھی ۔۔۔؟"

"دو بار آ چکی ہے ۔۔۔"

"مجھے جگا لیا ہوتا ۔۔۔"

"میں سمجھی ۔۔۔ تم تھکے ہوئے ہو ۔۔۔ اور وہ جھجکتی بھی بہت تھی ۔۔۔ اب تم جوان ہو گئے ہو نا ۔۔۔!

"اچھا میں ذرا چچی بیگماں کے گھر تک ہو آؤں ۔۔۔" اور جگدیپ اٹھ بیٹھا ۔

"چچی ۔۔۔ چچی ۔۔۔!" جگدیپ نے چچی بیگماں کے دروازے پر جا کر دستک دی ۔

"خدا تجھے سلامت رکھے ۔۔۔ میں قربان جاؤں ۔۔۔" بیگماں جیسے پھولی نہیں سما رہی تھی ۔

"خیریت سے تو ہو چچی ۔۔۔؟"

"تجھے دیکھ کر بہت خوش ہوں ۔۔۔ ذرا ٹھہر ۔۔۔ میں چارپائی پر چادر بچھا دوں ۔"

"کیا پہلے بھی تو چادر بچھایا کرتی تھی ۔۔۔ اب میں کوئی اور تو نہیں ہوں ۔"

"اب خدا کے فضل سے تو جوان ہو گیا ہے ـــــ سنا ہے اب تو نہایت اچھی تصویریں بنا لیتا ہے"۔

"تیری تصویر بناؤں چچی ـــــ؟"

"اب اس بڑھاپے میں میری کیا تصویر بنائے گا ـــــ اب تو چہرے پر جھریاں پڑ گئی ہیں ـــــ"

"میں جھریاں بھی بنا دوں گا ـــــ" دیپ نے کھل کر ہنستے ہوئے کہا۔

"بتا میں تیری کیا خاطر و مدارات کروں ـــــ"

"گھر میں جو کچھ بھی پکا ہے کھلا دو"

"میرے گھر کی پکی ہوئی کوئی چیز تو بھلا کب کھائے گا"

"کبھی کھلا کر بھی دیکھا ہے چچی ـــــ؟"

"میں اگر کھلاتی تو کیا کھا گیا ہوتا ـــــ؟"

"کیوں نہ کھا گیا ہوتا ـــــ تو نے کبھی کچھ کھلایا بھی ہے ـــــ نوراں مجھے کھلایا کرتی تھی"

"جانے بھی دے"

بیگماں نے ابھی "جانے بھی دے" کہا ہی تھا کہ دروازے کے پیچھے سے کسی کے کھلکھلانے کی آواز آئی۔

"وہ دیکھ ـــــ دروازے کے پیچھے کھڑی قہقہے لگا رہی ہے ـــــ اری ذرا باہر تو نکل ـــــ وہی دیپ تو ہے ـــــ کوئی اور تو نہیں ـــــ" اس کے بعد ماں نوراں کا بازو پکڑ کر اسے باہر لے آئی۔

"کوئی گھر آئے ـــــ تو کیا اس طرح کیا کرتے ہیں ـــــ!"

"جیسے میں تیرے گھر نہیں گئی تھی"۔

"تو نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔؟"

"میں نے سوچا تو کہیں ناراض نہ ہو جائے"۔

"تجھ سے ناراض ہو جاتا۔؟"

"ناراض ہی تو تھا جب ہی تو گاؤں نہیں آتا تھا"

"کیا تو نے مجھے کبھی بلوا بھیجا تھا۔؟"

"کیوں نہیں۔"

اب دیپ کے پاس کوئی جواب نہ رہا ـــ نوراں نے کبھی خط نہیں لکھا تھا۔ کبھی کوئی پیغام نہیں بھیجا تھا۔ پھر بھی وہ یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ اس نے کبھی اس کو بلوا نہیں بھیجا تھا ـــ دیپ نے ڈھٹائی کے ساتھ کہا ـــ مجھے تو نے کونسا خط لکھا تھا؟"

نوراں خاموش رہی لیکن اس نے کچھ اس انداز سے دیپ کی طرف دیکھا وہ شرمندہ ہو گیا۔

"کیا برگد کو پانی بھی دیا کرتی ہے۔؟"

"تجھے کیا۔؟"

دونوں ہنس پڑے جیسے صلح ہو گئی۔

"صبا اُسے جا کر دیکھ ـــ دن میں دو بار پانی دیا کرتی تھی ـــ" ماں نے کہا اور پھر وہ دیپ کی طرف منہ کر کے بولی ـــ "جب میں اسے پانی کا گھڑا لانے کیلئے کہتی تو کانوں میں انگلیاں ڈال لیا کرتی تھی لیکن برگد پر دو دو گھڑے پانی کے انڈیل دیا کرتی تھی۔

نوراں اور دیپ جب برگد کے نیچے گئے تو دیپ نے برگد کے نرم پتے اپنے ہاتھ

میں لے کر کہا ــــ تیرا برگد کتنا بڑا ہو گیا ہے "

"جیسے یہ برگد تیرا نہیں ہے "

دیپ نے آنکھیں بند کر لیں ــــ ایک بار تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے برگد کی چھاؤں میں ماں کے ہاتھ کی چھاؤں ملی ہوئی تھی ــــ وہ رات دیپ کی آنکھوں میں گھوم گئی جب وہ ماں کے ہاتھوں کی پکی ہوئی روٹیاں اپنی جھولی میں لیکر بیری کے نیچے بیٹھا ہوا تھا ــــ ماں کے دوپٹے کی اوٹ ــــ نوراں کی چنری ــــ

اور پھر نوراں کی چنری میں ستارے جڑے گئے ــــ دیپ نے چونک کر پوچھا ــــ نوراں اگر تو سر پر ستاروں والی چنری اوڑھ لے تو میں تیری ایک تصویر بناؤں گا"

"میرے پاس ستاروں والی کوئی چنریا نہیں ــــ" نوراں نے دھیمے سے کہا۔

جگدیپ کو ماں کا صندوق یاد آ گیا ــــ اور پھر چچی کے پاس رکھی ہوئی اس صندوق کی چابی یاد آئی۔

"اگر میں وہ چنری لا دوں تو ــــ"

"کہاں سے لائے گا؟"

"ماں کے صندوق میں پڑی ہوئی ہے "

"وہ تو چھوٹی شاہنی نے لی ہوئی ۔؟"

"نہیں چچی نے اسے سنبھال کر رکھا ہوا ہے "

"تو یوں ہی تصویر بنا لے "

"نہیں نوراں ــــ میں وہ چنریا لاؤں گا "

"کوئی دیکھ لے گا "

"تو ہمارے گھر آ جا ــــ اوپر کی منزل خالی پڑی ہے ــــ وہاں کوئی بھی نہیں

دیکھ سکے گا —— میرے رنگ اور برش بھی وہیں پڑے ہیں۔"

"بہت اچھا۔"

"کل سویرے آجانا۔"

اس رات کو دیپ نے چچی کے یہاں کھانا کھایا اور پھر چچی کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔

"دنیا میں ماں کی جگہ تو کوئی بھی نہیں لے سکتا لیکن چھوٹی شاہنی دل کی بری نہیں ہے دیپ۔!"

"بُری تو نہیں"

"تیرے پتا نے تیرے چچا کے ہاتھ سندیسہ بھیجا ہے کہ تجھ سے کہا جائے چھوٹی شاہنی کی طرف سے اپنے دل میں کوئی میل نہ لانا۔"

"میرے دل میں تو کچھ بھی نہیں ہے چچی۔"

"میں جانتی ہوں دیپ —— لیکن تیرے پتا ڈرتے تھے —— لڑکا جوان ہو گیا ہے —— کہیں دل میں کوئی گرہ نہ باندھ لے۔"

"اس بے چاری کا کیا قصور ہے چچی۔"

"مگر عمر کا بہت فرق ہے دیپ —— کوئی جوڑ نہیں —— بھگوان کی کرپا سے سیٹھ جی کی عمر کافی ہے —— تو بھی تو بڑھاپے کی اولاد ہے —— اور نئی شاہنی

کی بھرپور جوانی ہے ۔۔۔ نہ کسی کے بھلے میں ۔۔۔ نہ کسی کے بُرے میں ۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے ۔ جیسے اس نے اپنا من مار لیا ہو۔"

"خوش نہیں رہتی ۔؟"

"خوش تو ہے ۔۔۔ بھرا پڑا گھر ہے ۔۔۔ غریب گھر کی لڑکی تھی ۔۔۔ اس کے باپ نے سیٹھ جی کے یہاں اپنی زمین رہن رکھی ہوتی تھی ۔۔۔ کہتے ہیں سیٹھ جی نے زمین بھی لوٹا دی اور اس کے باپ کو کچھ نقد بھی دے دیا ۔۔۔

"مگر جوڑ کوئی نہیں ہے دیپ ۔!"

"ایک بات کہوں چچی ۔"

"کیا ۔۔۔"

"تیرے پاس صندوق کی چابی ہے نا ۔؟"

"میرے پاس تیری امانت پڑی ہے ۔"

"وہ کپڑے اس سے نکال دے ۔"

"نہیں دیپ ۔۔۔ وہ کپڑے تو جب بھگوان کی دیا سے دُلہا ۔۔۔"

"میری بات تو سن چچی ۔"

"تیری ماں کہا کرتی تھی ۔"

"اس وقت تک تو ان کپڑوں کا رواج نہیں رہے گا ۔"

"کیا تو بوڑھا ہو کر شادی کرے گا ۔؟"

"نہیں ۔۔۔ شہروں کی لڑکیاں اب ایسے کپڑے نہیں پہنتی ہیں ۔"

"کیا تو کسی شہر کی لڑکی سے شادی کرے گا ۔ ویسے تیری بات تو ٹھیک ہے ۔

اب تجھے گاؤں کی لڑکیاں پسند نہیں آسکتیں۔ کیوں دیپ ——؟ یہ جو تو نے پتلون پہن رکھی ہے تجھے بہت پھبتی ہے —— صاحب معلوم ہوتا ہے۔

"اچھا تو چابی دے دو" —— دیپ ہنسنے لگا۔

"اس میں ایک دوپٹہ ہے —— ستاروں والا —— ستارے یوں جڑے ہوئے ہیں کہ اس میں تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے"

"وہ دوپٹہ میں نکال لوں گا"

"چاندی کی جھانجریں ہیں ——"

"وہ نکال لوں گا"

چچی نے چابی لاکر اسے دیدی اور جگدیپ گھر جاکر عقبی کمرے میں وہ صندوق کھولنے لگا۔ صندوق کو ہاتھ لگاتے ہی دیپ کے دل میں کوئی چٹکیاں لینے لگا —— ماں کے ہر ایک لمس کو جیسے اس نے اپنے گلے سے لگا رکھا تھا —— دیپ کپڑوں کی تہہ نہ ٹٹول سکا —— اس نے چچی کو بلا بھیجا اور چچی نے آکر ستاروں والا دوپٹہ اور چاندی کی جھانجریں نکال کر اوپر کی منزل میں دیپ کے ٹرنک میں رکھ دیں۔ اور باقی صندوق جوں کا توں بھرا رہنے دیا۔

دیپ نے چھوٹی شاہنی کو بلوایا اور چابی اس کے حوالے کر دی۔

"رہنے دو دیپ —— گوٹے کناری والے کپڑے پہننے کی اب میری عمر کہاں ہے"

دیپ نے حیران ہو کر چھوٹی شاہنی کی طرف دیکھا —— اس کی عمر بمشکل بیس برس کی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ بائیس برس کی ہوگی وہ کہہ رہی تھی کہ گوٹے کناری والے کپڑے پہننے کی اب عمر کہاں ہے۔

"تیری عمر کیوں نہیں — تیرے کھانے پینے کا وقت ہے — لڑکے کی بات رکھ لے یہ صندوق وہ خوشی سے تجھے دے رہا ہے — پاس ہی کھڑی ہوئی چچی نے کہا اور چھوٹی شاہنی نے چابی لے لی۔

صبح جگدیپ ابھی سویا ہی پڑا تھا کہ نوراں آ پہنچی — آج نوراں نے دیپ کو جگایا۔

"کیا شہروں میں لوگ صبح کو اتنی دیر کے بعد جاگتے ہیں۔؟"

"تو ہے نوراں —؟"

"تجھ سے کہا تھا صبح سویرے آجانا —"

"صبح ہی تو ہے"

"میں واپس چلی جاتی ہوں — شہروں کی صبح شاید دوپہر کو ہوتی ہے"

"نہیں نوراں — یہاں بیٹھ جا — میں پانچ منٹ میں تیار ہو جاؤں گا"

دیپ نے جب تیار ہو کر اپنے رنگ اور برش نکالے تو ستاروں والا دوپٹہ بھی نکال لیا۔

"میں یہ دوپٹہ نہیں اوڑھوں گی —"

"کیوں —؟"

"اسے اوڑھ کر تو میں —" اس کے چہرے پر حجاب کی سرخی دوڑ گئی۔!

"ذرا سی دیر کے لیے اوڑھ لو گی تو کیا ہو جائے گا۔؟"

"کچھ نہیں"

"تو پھر اوڑھ لو —"

کچھ لمحوں کے لیے دونوں خاموش رہے اور پھر نوراں نے دوپٹہ اپنے سر پر ڈال لیا۔ آج سے کئی برس پہلے دیپ نے جو خواب دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں لرزنے لگا۔

لور دیپ نے جب اپنے برش کو رنگ میں ڈبویا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔
تصویر بنانے کے لیے

"کیوں ——— بنا تو رہا ہوں"

"دوپٹہ کی طرف دیکھتا چلا جا رہا ہے اور تصویر تو نہیں بنا رہا ہے"

"نہیں نوراں ——— تارے اتنے چمک رہے ہیں کہ میری آنکھیں چندھیائی جا رہی ہیں"

"دوپٹہ اتار دوں ——— ؟"

"نہیں ——— نہیں ——— یونہی بیٹھی رہ ———"

دیپ نے جیسے تیسے تصویر تو بنائی مگر اسے اطمینان نہ ہوا ——— وہ جانتا تھا کہ ابھی اس کے فن میں پختگی نہیں آئی ——— نوراں نے دوپٹہ اتار کر اسے تہہ کیا اور پھر اسے دلیپ کے ٹرنک میں رکھ دیا۔

"یہ دوپٹہ تو لے جا نوراں ——— تجھے بہت پھبتا ہے"

"ہش ———" اور نوراں بھاگ گئی۔

چھٹیاں ختم ہو گئیں اور جس روز دیپ کو شہر واپس جانا تھا۔ چچی بیگماں نے اس کے پاس آ کر کہا ——— "چھ مہینے تک نوراں کی شادی کرنی ہے ——— خط لکھوں تو آئے گا ——— ؟

"نوراں جائے گی تو ضرور آؤں گا"

جگدیپ سب سے رخصت ہو کر گاڑی پر سوار ہوا تو اس رات کو گاڑی میں سوتے ہوئے اس نے ایک سپنا دیکھا کہ کوئی اس کے ٹرنک میں سے تاروں والا دوپٹہ نکال کر اس کے ستارے ادھیڑ رہا تھا۔

ابھی چند ہی مہینے گزرے تھے کہ نوراں کی شادی کی اطلاع موصول ہوئی ۔ اس نے شہر کے تمام بازار کھنگال ڈالے مگر نوراں کو تحفہ دینے کے لیے جگدیپ کی نظر پہ کوئی چیز نہیں چڑھتی تھی ۔ جگدیپ اپنے ہاتھ سے کئی بار اسے دور ہٹاتا لیکن گھوم پھر کے تاروں والا دوپٹہ اس کی آنکھوں کے آگے آجاتا ـــــ وہ اپنے پہ جھنجلا اٹھا اور پھر اس نے گاؤں جانے کا ارادہ ترک کر دیا ۔

مہینوں کی ایک لمبی قطار گذر گئی ـــــ جگدیپ نے کمرشل آرٹ کے کورس کے تین سال پورے کر لیے اور فائن آرٹس کا دو سال کا کورس شروع کر دیا اب اس کے رنگوں سے زندگی جھلکنے لگی تھی ۔

اس کے بعد یہ خبر آئی کہ سیٹھ جی کا انتقال ہو گیا ـــــ ویسے بیمار چلے آ رہے تھے ۔ اسی لیے ان کی موت سے پہلے کسی نے جگدیپ کو کوئی خاص بات نہیں لکھی تھی ـــــ کسی کو یہ توقع بھی نہیں تھی ـــــ جس رات کو انہوں نے وفات پائی اس دن صبح کو اچھے بھلے تھے ـــــ باہر کھیتوں میں بھی گئے تھے ـــــ دوپہر کو انہوں نے کچھ نہ کھایا ۔ کہنے لگے ہاتھ پاؤں ٹوٹ رہے ہیں اور دل ڈوب رہا ہے ۔

جگدیپ کو ان کے انتقال کے متعلق تار ملا اور وہ اسی رات کو گاڑی پر سوار ہو گیا ۔

"تیرے سامنے — ہم بہت شرمندہ ہیں دیپ — موت نے ہمیں ایک دن کی بھی فرصت نہ دی کہ ہم تجھے مطلع کرتے —" جگدیپ کو اپنے گلے سے لگا کر چچی خوب روئی۔

جگدیپ نے چھوٹی شاہنی کی طرف دیکھا — اسکا اترا ہوا چہرہ اور بھی اتر گیا تھا۔ جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کا سونا پن گہرا — اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ جگدیپ کو کم از کم تیرہ دن کے لیے گاؤں میں رہنا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں بھی شروع ہو گئی تھیں۔ لہذا جگدیپ شہر واپس نہ گیا۔

جگدیپ کے ساتھی لڑکے اب گاؤں کے سجیلے جوان بنے ہوئے تھے۔ وہ کبھی کبھی ان میں جا بیٹھتا لیکن اس کی کسی کے ساتھ گاڑھی نہیں چھنتی تھی۔ لیکن وہ کنوؤں پر بیٹھے۔ کھیتوں میں کام کرتے اور ہنستے گاتے ہوئے اسے اچھے لگتے تھے — اس نے کئی خاکے بنائے لیکن ہر ایک شلوم کو وہ سوچتا تھا کہ آنے والی کل کے دامن میں بھی اس کے لیے کوئی دعوت نہیں ہے۔

چچی بیگماں کے گھر بھی وہ تین بار گیا تھا — نوراں اپنے سسرال میں تھی۔ اور چچی اسے بڑے فخر کے ساتھ بتاتی رہی کہ کیسے اس نے نوراں کے لیے گہنے بنوائے کیسے اس نے اپنی شادی کے جوڑوں پر کشیدہ کاڑھا۔ ایک نوراں پر ایک نیا روپ آیا، کیسے بارات آئی، کتنا اس کا زیور آیا اور ان کے گھر کتنی دیگیں چڑھائی گئیں۔

جگدیپ بیگماں کے گھر کے پچھواڑے بھی جاتا رہا — اپنے برگد کو دیکھتا رہا۔ نوراں نے سینچ سینچ کر اسے پالا تھا اور اب وہ اس قدر جوان ہو گیا تھا کہ پانی کا محتاج رہا تھا — اس کے پتوں نے ایک چھت بنا دی تھی — جگدیپ اس کی چھاؤں تلے اپنے کاغذوں اور رنگوں کو ادھر اُدھر بکھیر دیتا — ان کے کانوں میں کبھی کبھی آواز آتی —

"تو برگد کو سینچا کرے گی۔ نا نوراں —؟

"تجھے کیا — سینچوں یا نہ سینچوں۔"

"چلو مجھے کچھ بھی نہ سہی۔"

"تو شہر جا — تجھے گاؤں کے برگد سے کیا واسطہ —— سوکھ جائے یا جل جائے تجھے اس سے کیا غرض —!"

اور پھر اس کے جی میں آتا وہ کہے —" تو نے الٹی بات کہی تھی نوراں — گاؤں کے برگد سے تجھے کیا واسطہ — چاہیئے یہاں کو روز آ کر بیٹھا رہے - - - - -" اس کے بعد "تجھے کیا واسطہ" کا جملہ جگدیپ کے دل میں ایک ہلچل پیدا کر دیتا۔

چھٹیاں ابھی اب ختم ہونے والی تھیں —— ایک روز جگدیپ کے آگے روٹی رکھتے ہوئے چھوٹی شاہنی کا گلا بھر آیا —— "تو شہر چلا جائے گا دیپ —!"

"شہر — ہاں جانا ہی پڑے گا۔"

"تو اب شادی کیوں نہیں کر لیتا۔"

"پھر کیا ہوگا —— جگدیپ ہنس پڑا۔

"نہیں — بات یہ ہے کہ —" چھوٹی شاہنی اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی خاموشی میں کچھ ایسا درد تھا کہ جگدیپ کی ہنسی اس کے ہونٹوں پر جم گئی۔

"کیا بات ہے چھوٹی شاہنی —" جگدیپ کی آواز کچھ اتنی گمبھیر تھی کہ اس نے چھوٹی شاہنی کے دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

"تو مجھے چھوٹی شاہنی کیوں کہتا ہے — میں تیری ماں ہوں۔"

"یوں ہی کہہ رہا ہوں — سب ہی چھوٹی شاہنی کہتے ہیں —— اس لیے میں بھی کہہ دیتا ہوں۔"

"اور دیپ —— مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں تیری ماں نہیں ہوں۔
—— تو مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح معلوم ہوتا ہے"

جگدیپ خاموش رہا۔ مگر اس نے چھوٹی شاہنی کی طرف کچھ اتنے لگاؤ سے دیکھا جیسے دونوں نے بہن بھائی کا رشتہ قبول کر لیا ہو۔

"اچھا تو یہ بتاؤ شادی کر کے کیا کروں ۔!"

چھوٹی شاہنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ جیسے اس میں اب بولنے کی ہمت ہی نہیں تھی۔

"تمہیں کسی بات کی کمی نہیں محسوس ہوگی"

"کمی تو کوئی نہیں دیپ ۔ مگر اب میرا جینے کو جی نہیں چاہتا ——" چھوٹی شاہنی کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے، مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس کے اندر زندگی کا شعلہ بجھتا جا رہا ہے۔

"ایک بات پوچھوں"

"تجھ سے میں کچھ نہیں چھپا سکتی دیپ"

"اب تو خیر تم پر قہر نازل ہوا ہے لیکن جب میں پچھلی بار یہاں آیا تھا اس وقت بھی تم ——" اس سے آگے جگدیپ کو کچھ کہنے کے لیے سوجھا ہی نہیں۔

"اس وقت بھی میں زبردستی زندہ تھی ——" چھوٹی شاہنی ناخنوں سے مٹی کریدنے لگی ——

"میں بھی یہی کہنا چاہتا تھا"

"یہ سچی بات ہے دیپ"

"شادی تمہاری مرضی سے نہیں ہوئی تھی ۔؟ جگدیپ نے ذرا رک کر پوچھا۔

بےکسی کی مرضی —— اور کس کی مرضی —— میرے باپ نے مجھے بیچ دیا ۔ ۔ ۔ ۔
میرا تو اس وقت بھی یہی جی چاہتا تھا ۔ کہ میں کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں ——
لیکن میں نے خود ہی آپ سے کہا —— مر جاؤنگی تو بھی مردہ —— زندہ رہوں گی
تو بھی مردہ —— کوئی بات نہیں جیتے جی مر جاؤں گی —— باپ کا ہاتھ تو تنگ نہیں
رہے گا —— میرا ایک چھوٹا سا بھائی تھا —— ہو بہو تجھ جیسا معصوم —— اس کے منہ
کی طرف دیکھتی اور سوچتی ۔ کوئی بات نہیں —— اس کے سر سے قرضے کا بھاری بوجھ
اُتر جائے گا —— اب وہ خوشحال ہیں —— اپنے گھر میں مزے سے ہیں ۔ سکھی ہیں ۔"

جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا کہ صرف اس کے دل میں ہی خلا نہیں تھا ۔ بلکہ دنیا میں
ایسے کتنے ہی لوگ تھے جن کے سینوں میں بڑے بڑے گھاؤ تھے ۔

"اب مجھ سے اپنے آپ کو گھسیٹا نہیں جا رہا دیپ ۔"

جگدیپ سے کچھ بھی نہ کہا گیا —— چھوٹی شاہنی ہی نے کچھ دیر کے بعد کہا ۔
"دل تو میرا اسی دن کنوئیں میں ڈوب گیا تھا —— اب یہ تن باقی ہے ۔ مجھ سے اس
کا بوجھ نہیں اٹھایا جاتا ۔"

اس کے بوجھل سکوت کو کوئی بھی نہ توڑ سکا —— جگدیپ ساری شام کھیتوں
کی مینڈھ پر بیٹھا رہا ۔ جہاں کہیں کنواں نظر آتا اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کنوئیں
میں چھوٹی شاہنی نے چھلانگ لگا دی ہے —— وہ پاگلوں کی طرح اس کنوئیں میں جھانکنے لگتا ۔

جگدیپ رات گئے گھر لوٹا —— چھوٹی شاہنی چولھے پر توا رکھ کر اس کا انتظار کر
رہی تھی —— جگدیپ چوکے میں جا بیٹھا تو چھوٹی شاہنی نے گرم گرم روٹی اتار کر تھالی
میں ڈال دی ۔

"شہر میں تو کوئی تنور میں روٹیاں نہیں پکوا تا — تو چولہے کی روٹیاں کھاتا ہوگا
— میں تجھے چولہے کی روٹی پکا دیا کروں گی۔"

بہت دن ہوئے چھوٹی شاہنی نے اس سے یہ بات کہی تھی — اس دن کے بعد وہ جگدیپ کے لیے پتلی پتلی روٹیاں پکایا کرتی تھی۔

آج جگدیپ کا روٹی کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا — وہ باتیں کرنا چاہتا تھا — مگر وہ دل بہلانے کے لیے روٹی کھاتا رہا۔

کھانا ختم ہوا — چھوٹی شاہنی نے برتن سمیٹے — دہی کے لیے دودھ رکھا۔ جھاڑ پونچھ کر جگدیپ کا بستر لگایا اور پھر ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے وہ اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔

"کیا نیند نہیں آرہی دیپ —؟"

"نہیں کوئی کہانی سناؤ —" جگدیپ نے بچوں کی طرح التجا کی۔

"مجھے تو سب کہانیاں بھول گئی ہیں۔"

"کسی پری کی کہانی سنادو۔"

"کہاں ہوتی ہیں یہ پریاں دیپ — لوگوں نے یونہی باتیں بنا رکھی ہیں۔"

"بچپن میں تو کہانی سنایا کرتی ہوگی۔"

"کہانیاں سب ہی جھوٹی ہوتی ہیں دیپ —!"

"اچھا میں ایک کہانی سناتا ہوں۔"

"سناؤ۔"

"ایک لڑکی تھی — نہایت ہی خوبصورت — اس کے والدین کا جی چاہا کہ

وہ اس لڑکی کو بیچ کر ڈھیروں روپیہ حاصل کرلیں "۔

"چل ہٹ ۔۔۔"

"سنو تو سہی ۔۔۔ اور پھر جب اس لڑکی نے یہ بات سنی تو وہ آگ بگولا ہوگئی ۔۔۔ کنوئیں میں چھلانگ لگانے کے لیے چل دی ۔۔۔ جب وہ کنوئیں میں کودنے لگی تو پیچھے سے آکر ایک پری نے اسے پکڑ لیا "۔

"پریاں کہاں ہوتی ہیں دیپ ۔۔۔ پریاں بھی جھوٹی ہوتی ہیں ۔۔۔ ویسے تیری ایک بات سچی ہے "۔

"کون سی ۔۔؟"

"جس رات کو میں کنوئیں میں چھلانگ لگانے گئی تھی ۔۔۔ میرے پیچھے پیچھے ۔۔۔"

"کون آیا تھا ۔۔؟"

"جگت نے مجھے کہیں دیکھ لیا تھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلا آتا تھا ۔ ۔ ۔"

"جگت کون ہے ؟"

"ہمارے گاؤں کا ایک لڑکا ۔۔۔ دو برس سے میرے پتا کی منت سماجت کر رہا تھا کہ ویراں کی شادی مجھ سے کر دو "۔

"تمہارے پتا کیوں نہیں مانتے تھے ۔۔؟"

"وہی زمین کا جھنجھٹ تھا ۔۔۔ ساری زمین تو سیٹھ جی کے یہاں رہن پڑی ہوئی تھی ۔۔۔"

ایک پتھریلا سکوت طاری ہو گیا ۔۔۔ پھر جیسے پتھر کے دل میں کوئی کیڑا کلبلا اٹھا ۔

"جگت کیسا تھا شانتی ۔؟"

"اس جیسا کون پیدا ہو سکتا ہے دیپ ــــ اس کے قدموں تلے تو دھرتی بھی کانپتی تھی ۔"

"کیا اس نے تمہارے پتا کو روکا نہیں ــــ؟"

"جب ایک طرف چاندی کی جھنکار سنائی دے رہی ہو دیپ تو پھر کوئی آواز کان میں نہیں پڑتی ۔"

"کیا وہ خاموش رہا ۔؟"

"نہیں دیپ ــــ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اگر اجازت دو تو وہ مجھے ایسی جگہ لے جائے گا جہاں کوئی میری گرد کو نہ پہنچ سکے ۔"

"پھر کیا ہوا ۔؟"

"میں ہی ڈر گئی ــ ادھر میرے پتا سیٹھ جی سے وعدہ کر چکے تھے ــ میں سوچتی تھی اگر میں چلی گئی تو میرے بعد میرے پتا اور میرے بھائی کا کیا حال ہوگا ۔"

"میں نے تمہیں سچی کہانی سنائی ہے نا ۔؟"

"سچی کیسے ۔؟"

"میں نے کہا تھا کہ جب وہ لڑکی کنوئیں میں کودنے لگی تو پیچھے سے اسے ایک پری نے پکڑ لیا ۔"

"ہاں ــــ"

"اس پری کا نام زندگی بھی ہے شانتی ــــ"

"کون سی زندگی دیپ ۔؟"

"یہی زندگی ــــ اور کون سی ــ"

"سب جھوٹی باتیں ہیں دیپ ــ؟"

"جگت اب کہاں ہے ــ؟"

"اپنے ہی گاؤں میں "

"کیا تم کبھی گاؤں نہیں گئیں ــ؟"

"نہیں دیپ ــــ جس دن میرے پتا نے مجھے ڈولی میں بٹھا کر الوداع کیا تھا اسی دن میں نے یہ ٹھان لی تھی کہ میں اب لوٹ کر نہیں آؤں گی "

"کیوں ــ؟"

"جن والدین نے مجھے بیچ کر دام کھرے کر لیے ــــ میں ان کی بھلا کیا ہوتی ہوں "

"انہوں نے کئی سندیسے بھیجے ــــ سیٹھ جی سے بھی انہوں نے کہا ــــ مگر میرا وہاں جانے کو جی نہ چاہا ــــ اب بھی سیٹھ جی کے بیت جانے پر تیرے سامنے وہ میری منتیں کرتے رہے لیکن میں نے ایک ہی "نہیں" پکڑ لی ــــ اور پھر دیپ ــــ" اس سے آگے شاہنی کچھ نہ کہہ سکی ۔

جگدیپ نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا ــــ "تم کیا کہنے والی تھیں ــــ ؟"

"پہلے چلی جاتی تو چلی جاتی ــــ لیکن اب تو میں ہرگز نہیں جاؤں گی ــــ اب تو مجھے قسم ہے "

"کیوں ــ؟"

"مجھے جگت سے ڈر لگتا ہے "

"ابھی ابھی اس نے مجھے کسی کے ہاتھ سندیسہ بھجوایا تھا کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے ــ

اگر میں رضامند ہوں تو . . . . ۔"

"پھر تو پری والی کہانی بالکل سچی ہے ۔"

"سچی کہاں ہے دیپ ۔؟ یہ تو زخموں پر نمک چھڑکنا ہے ۔"

"تم جھوٹ کو سچ کیوں نہیں بنا لیتیں ۔؟"

شاہنی تڑپ کر اپنی چارپائی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی ۔

"دیپ تو کیا کہہ رہا ہے ۔؟"

"مَیں سچ کہہ رہا ہوں ۔"

"کیا پاگل ہو گیا ہے ۔؟"

"نہیں ۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں شاہنی ۔"

"بھگوان کو منظور نہیں تھا تو . . . . . ۔"

"اسے اب منظور ہو گا ۔۔۔ تم جگت کو سندیسہ بھیج دو ۔"

"دیپ ۔۔۔ دیپ ۔۔۔ !" شاہنی کی آواز کپکپا رہی تھی ۔

"ایک بار تو ہمت کر کے دیکھو شاہنی ۔"

"نہیں ۔۔۔ دیپ نہیں ۔۔۔ میں مر چکی ہوں مرے ہوئے کو اور کیوں مارتے ہو ۔؟"

"اپنے دل کو مضبوط کیوں نہیں بناتی ہو شاہنی ۔"

"میں اپنا من مار چکی ہوں دیپ ۔۔۔ تو ایسی باتیں نہ کر ۔"

"ذرا سمجھ کر بتاؤ شاہنی ۔۔۔ ایک طرف زندگی ہے اور ایک طرف موت ۔"

"مجھے موت ہی منظور ہے دیپ ۔۔۔ میں جس آگ کو بجھا چکی ہوں اسے دوبارہ روشن نہ کر ۔"

"کبھی کبھی پریوں کی کہانی بھی سچی ہو جاتی ہے، شاہنی"

ابھی تک شاہنی کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے تھے۔ لیکن اب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جگدیپ نے شاہنی کے پتا کو بلوا بھیجا اور اسے اس کے حوالے کر دیا۔ گاؤں والوں کو صرف اتنا پتہ چلا کہ چھوٹی شاہنی میکے جا رہی تھی ۔۔۔ گہنوں کی صندوقچی جگدیپ نے اپنے ہاتھوں سے بھری اور چھوٹی سیٹھانی کو اس کے میکے تک چھوڑنے گیا۔

"اس گھر میں سب کچھ تمہارا ہے شاہنی ۔۔۔ جب بھی تمہیں ضرورت ہو اور جتنی بھی ضرورت ہو۔۔۔"

"مجھے شرمندہ نہ کرو دیپ ۔۔۔" شاہنی جگدیپ کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔ اور پھر اس نے کہا ۔۔۔ "مجھے شاہنی کیوں کہتے ہو ۔۔۔ ویراں کہو ویراں ۔۔۔"

گاؤں سے لوٹتے ہوئے جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل میں خلا پڑ گیا تھا ۔۔۔ ایک سرور، ایک خمار میں وہ گھوڑی پر سوار رہا۔ اور نہ جانے کب واپس گاؤں لوٹ آیا۔ اس نے اپنی گھوڑی کا رخ چچی بیگماں کے گھر کی طرف موڑ دیا۔ گھوڑی سے اتر کر مکان کے پچھواڑے میں برگد کے پیڑ تلے جا کھڑا ہوا۔

برگد کی چھاؤں اسے آج جتنی کبھی حسین نہیں معلوم ہوئی تھی ـــــ برگد کے پتوں سے اس نے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں ـــــ اور پھر اس کے دل میں ایک کسک پیدا ہوئی ـــــ "چھاؤں ـــــ صرف چھاؤں ـــــ ایک بھی پھل نہیں ـ تو نے کہا تھا نوراں کہ بیری کا پیڑ لگائیں ـــــ سرخ سرخ میٹھے میٹھے بیر کھائیں گے ـ آم کا پیڑ لگالیں لیکن میں نے ہی کہا تھا ـــــ "پھلوں کی کیا ضرورت ہے ـــــ میرے لیے چھاؤں ہی بہت ہے ـــــ نوراں ـــــ نوراں ـــــ میری قسمت میں کوئی پھل نہیں تھا ـ"

جگدیپ نے فائن آرٹس کورس کے دونوں سال پورے کر لیے ــــ اسکول کے پرنسپل نے دیکھا کہ جگدیپ کے اندر کوئی چنگاری سلگ رہی ہے اس کی بنائی ہوئی تصویروں میں ایک معنویت ہوتی تھی اور اس کے رنگوں سے اس کے دل کی حرارت آشکارا ہوتی تھی ۔ پرنسپل یہ نہیں چاہتا تھا کہ جگدیپ اس اسکول کو چھوڑ کر چلا جائے ۔

اس نے جگدیپ کو اس اسکول میں ملازمت کی پیش کش کی ۔ مگر اس کو نوکری کی خواہش نہیں تھی ــــ ایک عظیم فن اس کے اندر جیسے انگڑائیاں لے رہا تھا ۔ گاؤں کی زمین سے جگدیپ کو گزر بسر کے لیے اچھا پیسہ مل رہا تھا ــ اس لیے اب اپنے ماموں کے مکان کی بالائی منزل پر اپنے لیے دو کمرے تعمیر کروائے تھے ــــ ایک کمرے کو اپنا سٹوڈیو اور دوسرے کو اپنی خواب گاہ بنا لیا تھا ۔

"جس منزل کی آرزو آپ نے میرے دل میں پیدا کی ہے ۔ اب ذرا اس کی دشواریوں کا مجھے سامنا کرنے دیجئے اور اس طویل راستے پر جہاں تک میں چل سکتا ہوں مجھے چلنے دیجئے ــــ مجھے ملازمت کے بندھنوں میں آپ کیوں جکڑتے ہیں "

" جگدیپ نے اپنے پرنسپل کو منا لیا ــــ "

"بس ماڈل سے پینٹنگ کرنا چاہتا ہوں —— آپ میری رہنمائی کرتے رہیئے گا۔" ایک دن جگدیپ نے اپنے پرنسپل سے کہا۔

"ہمارے ملک میں اس کا رواج نہیں —— کوئی لڑکی ماڈل بننے کے لیے تیار نہیں ہوگی —— تم کیا کروگے —— یہ کیسے ہوگا ——؟" پرنسپل کو یقین تھا کہ جگدیپ جیسا شاگرد نہ پہلے اسے ملا تھا اور نہ آئندہ کبھی ملے گا —— وہ اس کے اندر کی چنگاری کو بجھنے نہیں دینا چاہتا تھا۔

لیکن سماجی ماحول اتنا اچھا نہیں تھا —— اس کو اپنے سامنے کئی دشواریاں نظر آرہی تھیں —— دوسرے دن پرنسپل نے جگدیپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تمہارا کردار فولاد کی طرح مضبوط ہونا چاہیئے دیپ —— جب ہی تمہارے اندر کا فن کار زندہ رہے گا۔"

چند روز بعد ایک شام کو پرنسپل نے آکر جگدیپ کے سٹوڈیو کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ جگدیپ نے دروازہ کھول دیا —— ایک سانولی اور خوش جمال لڑکی پرنسپل کے ساتھ تھی۔

"یہ رمند رہے —— میری بیٹی —— میرے دوست کی بیٹی —— ہم اسے رمی کہہ کر بلاتے ہیں۔"

جگدیپ کو اب اس سے آگے کوئی استفسار کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کو اتنی توقع ہی نہیں تھی —— جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑ رہے ہوں۔

"میں جلدی میں ہوں —— ٹھیک ساڑھے چار بجے میرا لیکچر ہے —— سوا چار

ہو چکے — پرنسپل نے جگدیپ کے کندھے پر ایک تھپکی دی اور الٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

"رمندر بہن — میں تمہارا کیونکر شکریہ ادا کروں — ؟" جگدیپ نے ایک نفیس کرسی کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

رمندر بیٹھ گئی لیکن اس نے کسی جوش و خروش کا اظہار نہ کیا۔ جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے رمندر کو اس کا اپنا اشتیاق کھینچ کر نہ لایا ہو — پتا کا یا پتا کے دوست کا کہا نہ ٹال سکی ہو اور آگئی ہو۔

اس کے باوجود جگدیپ کے اشتیاق میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے رمندر کا دل بہلانے کے لیے بڑے چاؤ کے ساتھ کہا — "میں پرنسپل صاحب کی ہر ایک توقع پر پورا اتروں گا — میں بڑی محنت کروں گا — دن رات محنت کروں گا۔"

رمندر نے جیسے جگدیپ کی بات کو غور سے نہ سنا — جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنی بات کو ٹھیک طرح نہ کہہ پایا ہو — اس نے کچھ اور بھی کہنا چاہا مگر رمندر اس کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی۔

جگدیپ خاموش ہو گیا — اچانک اس کے دل میں یہ یقین پیدا ہوا کہ وہ تھوڑے ہی دنوں میں رمندر کا اعتماد حاصل کرے گا اور پھر وہ آج کی طرح بددل نہیں رہے گی — آج جگدیپ نے اپنے پرنسپل کی اس ہدایت کا مطلب پا لیا — "تمہارا کردار فولاد کی طرح مضبوط ہونا چاہیئے دیپ — جب ہی تیرا اندر کا فن کار زندہ رہے گا۔"

"کیا میں آپ کو اپنی کچھ تصویریں دکھاؤں — ؟ اچھی تصویریں تو نہیں ہیں — ابھی میرے ہاتھ میں پختگی نہیں آئی —"

"میں نے آپ کی تقریباً تمام تصویریں دیکھی ہوئی ہیں —" رمندر نے آہستہ سے کہا —

"شاید پرنسپل صاحب ان تصویروں کو گھر لے جاتے رہے ہیں —" جگدیپ یہ کہہ خاموش ہو گیا — اسے اس بات پر حیرانی ہوئی کہ اتنا پُر تپاک دل رکھنے والا پرنسپل ایسی روکھی پھیکی لڑکی کو اپنی بیٹی کیونکر کہتا ہے۔

"کیا چائے منگواؤں — آپ تھک گئی ہوں گی —" جگدیپ نے کہا۔

"نہیں —"

بات جگدیپ کی سمجھ میں نہ آئی — رمندر کی "نہیں" — کچھ ایسی تھی کہ اسے دوبارہ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

آپ اب تھک گئی ہوں گی — کیا آپ پھر کسی دن آ سکیں گی —؟" جگدیپ نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔

"کل آؤں گی —" رمندر بولی اور پھر جگدیپ سے کچھ کہے بغیر تصویر کی طرف ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

"کیا میں آپ کو چھوڑ آؤں —؟" جگدیپ نے دوڑ کر پوچھا۔

"نہیں — میرا سائیکل نیچے پڑا ہے — میں خود چلی جاؤں گی۔"

رمندر نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی۔

جگدیپ اپنے اسٹوڈیو میں لوٹ آیا — یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ رمندر کا وطیرہ اچھا تھا یا برا — لیکن اسے اتنا ضرور محسوس ہوا کہ کمرے کی ہوا بوجھل ہو گئی تھی — پھر اس نے تصویر کی طرف نظر دوڑائی — تصویر ادھوری تھی — بالکل نامکمل —

مگر لکیروں میں سے ایک اچھی تصویر ابھرتی ہوئی نظر آنے لگی تھی ــــ وہ سوچنا چھوڑ کر تصویر کی لکیروں کو مزید سلوارنے میں مصروف ہو گیا۔

رمندر اگلے روز بھی آئی ــــ اس سے اگلے دن بھی اور پھر وہ روز آنے لگی ۔ جیسے وقت مقرر کرنے یا کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی ــــ وہ عین وقت پر آتی اور واپس چلی جاتی۔

ہر روز جگدیپ حسب معمول اسے چائے پینے کے لیے کہتا اور ہر روز وہ سخت گیر لہجہ میں انکار کر دیتی ــــ تصویر کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر بھی منہ سے کچھ نہ کہتی ــــ اس کی بے رخی نے اسے جیسے جکڑ رکھا تھا۔

دسمبر میں دن کو بھی ہر ایک پل تخ بستہ ہوتا ہے ــــ رمندر جب آتی تھی تو اس نے شال اوڑھا رکھا ہوتا تھا مگر تصویر کے سامنے بیٹھتے ہوئے اسے اپنا شال اتارنا پڑتا تھا۔ اور اس نے انگ انگ میں سرایت کرتی ہوئی سردی اس کے چہرے پر ظاہر ہونے لگتی تھی۔ جگدیپ نے کمرے میں انگیٹھی کا انتظام کر لیا اور کمرہ کافی گرم ہو گیا رمندر آرام سے بیٹھ جاتی مگر ابھی تک اس نے جگدیپ کی فرمائش پر ایک پیالی چائے نہیں پی تھی۔ "پاپا جی کہہ رہے تھے کہ اگر آپ کھیتوں پر جا کر خاکہ بنانا چاہیں۔ تو میں آپ کے ساتھ جا سکتی ہوں ــــ ایک دن رمندر نے کہا۔

جگدیپ خوشی سے اچھل پڑا۔

رمندر کی بے رخی سے اگرچہ وہ مایوس ہو چکا تھا۔ لیکن آج جب اس نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی بے رخی کانٹوں کی طرح چبھنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ رمندر کا یہ فقرہ " پاپا جی نے کہا تھا اگر ــــ تو میں آپ کے ساتھ جا سکتی ہوں ــــ اس کے دل پر ایک

تازیانہ کی طرح پڑا۔ جانے نہ جانے کا اس سے کوئی واسطہ نہیں تھا ــــ وہ تو جیسے اپنے پاپا جی کے حکم کی تعمیل کر رہی تھی۔

کیسے چلیں گے ــــ؟ سامان ایک تانگہ میں رکھ لیں گے ــــ جگدیپ نے کہا۔

کیوں ــــ؟ سائیکلوں پر چلیں گے ــــ میں اپنے سائیکل پر آجاؤں گی۔ آپ اپنی چیزیں اپنے سائیکل پر رکھ لیجیے گا ــــ کل گیارہ بجے!" اور رمندر یہ حکم دے کر وہاں سے چلی گئی۔

جگدیپ نے کئی باتیں سوچیں ــــ دوپہر کی روٹی بنوا کر ساتھ لے چلے ــــ تھرموس میں چائے لے چلے ــــ لیکن رمندر کی نہیں ــــ اس کے دل میں ایک پتھر کی طرح جم گئی تھی اور اس پتھر کو ہٹانے کی اس میں جرأت نہیں تھی۔

دوسرے دن گیارہ بجے تھے جب رمندر آئی ــــ جگدیپ نے اپنا سامان اپنے سائیکل کے آگے اور پیچھے باندھ لیا اور پھر بڑی جسارت سے کام لیتے ہوئے اس نے رمندر سے پوچھا ــــ "کیا کچھ کھانے کے لیے راستہ میں لیتے چلیں ــــ؟"

"کوئی ضرورت نہیں ــــ یہ کہہ کر رمندر نے اپنے سائیکل کے پیڈل پر پاؤں رکھ دیا۔

چھ سات میل تک سائیکل چلانے کے بعد جگدیپ اور رمندر شہر کے باہر نہر سے گذر کر کھیتوں میں پہنچ گئے ــــ جگدیپ نے ایک دل پسند جگہ کا انتخاب کیا اور سائیکل ایک طرف رکھ کر سامان کھولنے لگا۔

جگدیپ ایک یا ڈیڑھ بجے تک کام کرتا رہا۔ سرسوں کے کھیتوں کا سونا جگدیپ کے کاغذوں پر اترتا رہا اور پھر جگدیپ کی نگاہ ایک انتہائی سوکھے ہوئے پیڑ پر پڑی ــــ اچانک اسے ایک خیال سوجھا ــــ سوکھے ہوئے پیڑ کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی

تھیں لیکن ایک بھی پتہ کسی شاخ کے ہاتھ میں نہیں تھا ـــــ" اگر اس پیڑ کے تنے کے ساتھ لگ کر رمندر کھڑی ہو ـــــ میں تصویر بناؤں اور اس کے نیچے لکھ دوں ـــــ پت جھڑ اور بہار ـــــ!"

وہ کاغذ پر سرسوں کے کھیتوں کا سونا ایک طرف رکھ کے "پت جھڑ اور بہار!" کی تصویر بنانے لگا۔

دو بج گئے ـــــ جگدیپ نے ہاتھ سے برش ایک طرف رکھتے ہوئے کہا ـــــ "دیوی جی ـــــ آپ تو برت رکھ سکتی ہیں لیکن میں نہیں رکھ سکتا۔ آؤ واپس چلیں۔"

رمندر نے اپنے سائیکل سے بندھی ہوئی ٹوکری کھولی اور ایک طرف تولیہ بچھا کر بندھے ہوئے پیکٹ کھول دیئے ـــــ رمندر تھرموس میں نہ چائے لانا بھولی تھی نہ پلیٹ اور پیالیاں ـــــ کھانے والی چیزوں کے پیکٹ اتنے تھے کہ دونوں مل کر انہیں دن بھر ختم نہیں کر سکتے تھے۔

سب چیزیں نہایت اچھی تھیں۔ جگدیپ کھائے چلا جا رہا تھا۔ ابھی پلیٹ میں پہلی چیز ختم نہیں ہونے پاتی تھی کہ رمندر اس میں اور ڈال دیتی تھی اور جگدیپ ضرورت سے زیادہ کھا رہا تھا لیکن اس کے دل پر جو بوجھ تھا اس سے اُٹھایا نہیں جا رہا تھا ـــــ "میں رمندر کا اعتماد نہیں حاصل کر سکا۔ میرے اتنے دنوں کا برتاؤ ـــــ میری محنت ..."

جگدیپ نے اپنے دل کو ذرا اور ٹٹولا ـــــ پچھلے دنوں جگدیپ کے دوستوں نے اس پر کئی آوازے کسے تھے ـــــ "آج کل تم بھلا کسی سے کیوں ملنے لگے ـــــ ایسا ماڈل ہاتھ تو دوست نظروں پر کہاں چڑھتے ہیں ـــــ" جگدیپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور

اس نے گرج کر دوستوں سے کہا تھا — "رمندر تو مجھے اپنی بہن سے بھی زیادہ . . . . !"

کھانا ختم ہُوا — رمندر نے جگدیپ کو چائے کی پیالی دی — اس کے بعد مزید ۲ دو گھنٹے کام کر کے دونوں اپنے سائیکلوں پر واپس چلے آئے ۔

سردیوں میں بھر پور محنت کرنے کے بعد جگدیپ نے کئی تصویریں بنائیں لیکن تین تصویریں اس نے بڑی جانفشانی سے تیار کی تھیں — ایک تصویر کا عنوان تھا ۔ "دنیا" اس تصویر میں جو لڑکی تھی وہ اس نے رمندر کے ماڈل سے تیار کی تھی — دنیا اسے خوبصورت معلوم ہوئی تھی — دنیا کا رنگ اُس نے اپنے تصور سے بھرا تھا — دوسری تصویر :— "پت جھڑ اور بہار" تھی — یہ تصویر اس نے سوکھے پیڑ اور رمندر کے بُت کو جوڑ کر تیار کی تھی :— تیسری تصویر کتنے برس ہوئے نوراں کے سر پر ستاروں والا دوپٹہ پہنا کر اس نے جو خاکہ بنایا تھا اس سے تیار کی تھی — اس تصویر کا نام "سپنا" رکھا تھا — ستاروں والے دوپٹہ کے ارد گرد اس نے بادلوں کی طرح سپنے لپیٹ دیئے تھے اور نوراں کی آنکھیں اس طرح تھیں جیسے وہ سپنوں کے بوجھ سے جھک گئی ہوں ۔

مارچ کا مہینہ آپہنچا ـــــ شہر کی ایک نہایت اچھی عمارت میں ہندوستان کے مشہور مصوروں کی تصویروں کی نمائش منعقد ہونے والی تھی ـــ پرنسپل کی فرمائش تھی کہ اس نمائش میں جگدیپ کی ایک پینٹنگ رکھی جائے ـــــ جگدیپ ابھی اپنے فن کو اس قابل نہیں سمجھتا تھا۔

بہت سی باتوں میں پرنسپل کی رائے اسے زیادہ وزنی نہیں معلوم ہوتی تھی ـــــ اس نے انکار کر دیا ـــــ پرنسپل نے اس کی تصویر کے لیے جگہ محفوظ کرالی تھی اور وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔ اس نے جگدیپ کے اسٹوڈیو میں آکر تینوں تصویریں دیکھیں۔ ہر ایک تصویر کی بار بار جانچ کی اور آخر کار اس نے "سپنا" عنوان کی تصویر کو نمائش میں بھیجنے کے لیے منتخب کر لیا۔

"کتنی قیمت کی چٹ لگائی جائے ـــ" پرنسپل نے پوچھا ـــ اس کے پاس رمندر بھی کھڑی تھی اور جگدیپ بھی ـــــ دونوں میں سے کوئی نہ بولا۔ پرنسپل نے خود ہی کہا ـــــ "دو سو سے کم نہیں ہونی چاہیے ـــ"

"میں یہ تصویر بیچنا نہیں چاہتا ـــ!" جگدیپ نے آہستہ سے کہا۔

"خریدتا کون ہے ـــ یونہی ایک رواج ہے ـــ قیمت کی چٹ ضرور لگانی چاہیئے۔"

"نہیں ـــ یہ چپ لگا دو ـــ تصویر بیچنے کے لیے نہیں ہے ـــ"

ایسا کرنا غرور کے مترادف ہوگا ـــ اچھا ایسا کرو ـــ دو سو کی جگہ تین سو لکھ دو تاکہ اگر کوئی خریدنا بھی چاہے تو نہ خریدے ـ ساڑھے تین سو لکھ دو ـ

جگدیپ خاموش ہوگیا ـــ رمندر نے بھی کچھ نہ کہا ـ پرنسپل نے وہ تصویر نمائش میں بھیج دی

نمائش منعقد ہوئی ـ شائقین اور فن کاروں کا ایک جمگھٹا لگ گیا ـ شہر میں نمائش کی باتیں ہوتیں ـــ ان باتوں میں عقل و دانش کو دخل نہیں تھا صرف رسماً ایسی باتیں کی جاتی تھیں ـــ یہ ٹھیک تھا کہ لوگ اپنے آپ کو فن کار کا پرستار ظاہر کرنے کے لیے باتیں چھیڑ دیتے تھے مگر یہ بھی درست تھا کہ جہاں دو چار جمع ہوئے اِن تصویروں کی باتیں کرنے لگے ـ

پھر پتہ چلا کہ جگدیپ کی تصویر فروخت ہوگئی ہے ـــ نمائش کے منتظمین نے اسے مبارک باد دی ـــ لوگ اب اور بھی زیادہ اشتیاق کے ساتھ اس تصویر کو دیکھ رہے تھے لیکن جگدیپ کا چہرہ کچھ اس طرح ہوگیا جیسے کسی نے اِس کو دھکا دے کر اس کے ہاتھ سے اس کی چیز چھین لی ہو ـ

نمائش ختم ہوگئی ـــ جگدیپ چپ چاپ اپنے سٹوڈیو میں بیٹھا رہتا ان دنوں اپنے برشوں اور رنگوں کی طرف دیکھنے کو اس کی طبیعت نہیں چاہتی تھی ـ رمندر بھی کئی دنوں سے نہیں آئی تھی ـــ جگدیپ کے سٹوڈیو پر جیسے ویرانی اور سُونا پن مسلط ہوتا جا رہا تھا ـ

ایک دن جگدیپ اپنی اداسی کو برداشت نہ کر سکا اور وہ پرنسپل سے ملنے کیلئے

اس کے گھر چلا ـــــ پرنسپل گھر پر موجود نہیں تھے ـــــ اس نے رمندر کے گھر کا پتہ پوچھا اور اِدھر چلا گیا۔

شام کا ہلکا دھندلکا اس کے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا ـــــ نوکر نے اسے رمندر کا کمرہ دکھایا اور کمرے کے دروازہ کو اس نے آہستہ سے ٹھوکر لگائی ـــــ سامنے رمندر کھڑی تھی۔

"آپ ـــــ" رمندر جیسے کانپ گئی۔

جگدیپ اب رمندر کی بے رُخی سے بالکل مانوس ہو چکا تھا ـــــ اس کی بے اعتنائی کو اب وہ اس کی فطرتِ ثانی تسلیم کر چکا تھا ـــــ آج جگدیپ حیران تھا رمندر کی گھبراہٹ نے اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ پیدا کر دی تھی۔

جگدیپ کمرے میں دو قدم آگے بڑھ چکا تھا لیکن وہ وہیں کا وہیں رُک گیا ـــــ اور رمندر نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے کُرسی کا سہارا لیا۔

"ری لیا میں چلا جاؤں ـــــ؟" جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس سے کوئی بھاری گناہ سرزد ہو گیا تھا۔

رمندر کا رنگ نچڑے ہوئے لیموں کی طرح زرد تھا ـــــ اس سے کچھ کہا نہ گیا ـــــ جگدیپ نے گھبرا کے کمرے میں دیکھا ـــــ سامنے بڑی الماری کے دونوں پٹ کھلے تھے ـــــ الماری میں اس کی تصویر "سپنا" جڑی ہوئی تھی۔

"ری ـــــ جگدیپ کے منہ سے نکلا اور وہ گھبرا کر الماری کی طرف لپکا ـــــ

جگدیپ نے ایک بار تصویر پر نظر دوڑائی اور پھر رمندر کی طرف دیکھا ـــــ رمندر اپنی ہتھیلیوں سے منہ کو چھپا کر سسکیاں لے رہی تھی۔

"ری — !" جگدیپ کی رگ رگ میں جیسے کسی نے گرم گرم سیسہ بھر دیا تھا۔

"ہاں — میں نے ہی خریدی ہے —" رمندر شاید اپنے آنسوؤں کی کمزوری پر جھلا اٹھی تھی اسے پھر اپنے آپ پر غصہ آگیا تھا۔

رمندر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر اس نے آہستہ سے کہا۔ تمہیں یہ تصویر خریدنے کی کیا ضرورت تھی — تم مجھ سے کہتیں — میں اسے تمہارے کمرے میں آکر لٹکا دیتا۔"

رمندر کے انگ انگ میں جیسے زہر جوش مار اٹھا اور وہ کرسی سے اٹھ کر دوڑتی ہوئی الماری کی طرف گئی — تصویر رمندر کے ہاتھوں میں تھی اور پھر وہ پورا زور لگا کر تصویر کے پرزے اڑانے لگی۔

جگدیپ پتھر کی طرح جم گیا تھا — رمندر کہہ رہی تھی — نوراں — نوراں — نوراں — میں اس کی تصویر کو برداشت نہیں کر سکتی — نہیں کر سکتی۔ میں نے اس کو اسی لیے خریدا تھا کہ پھاڑ کر پھینک دوں — !"

کاغذ کے ٹکڑے فرش پر چاروں طرف پھیل گئے — کاغذ کے کتنے ہی ٹکڑے جگدیپ کے قدموں کے قریب پڑے ہوئے تھے — رمندر نے شاید کچھ اور بھی کہا لیکن جگدیپ کو اب کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا — ایک ہی لفظ جگدیپ کے کانوں میں گونج رہا تھا — نوراں — نوراں — نوراں —"

پتہ نہیں کب وہ اس کمرے سے اٹھ کر چلا آیا — رمندر کاغذ کے ان ٹکڑوں کے پاس فرش پر بیٹھی سسک رہی تھی —

شہر کی فضا میں اب جگدیپ سے سانس نہیں لیا جاتا تھا ۔۔۔ کسی روز وہ گھنٹوں نہر کے کنارے بیٹھا رہتا اور کسی روز شہر سے دُور کھیتوں کی مینڈھ پہ ۔۔۔ اسے یُوں محسوس ہوتا شہر کی فضا میں جیسے تلخی گھُلی ہوئی تھی ۔۔۔ تشنگی سے اس کا حلق سوکھتا جا رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر کڑوی اور کسیلی پپڑیاں جمتی جا رہی تھیں سٹوڈیو میں بیٹھا ہوتا تو جگدیپ کو یُوں لگتا جیسے تمام رنگ آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہوں گے ۔۔۔ ایک میلی اور کالی دھار بن کر اس کی آنکھوں پہ برس رہے ہوں ۔۔۔

کئی برس ہوئے جگدیپ نے ایک خواب دیکھا تھا ۔۔۔ کوئی نوراں کے سر پر اوڑھی ہوئی ستاروں والی چنری کے ستارے ادھیڑ رہا تھا ۔۔۔ آج کئی برسوں کے بعد وہ خواب اور بھی بھیانک ہو گیا تھا ۔۔۔ کوئی نوراں کے چہرے کو ناخنوں سے نوچ رہا تھا ۔۔۔

اگلے ہفتہ جگدیپ لاہور چھوڑ کر چلا گیا ۔۔۔ ایک بار تو اس کا جی چاہا کہ وہ اپنے گاؤں جائے لیکن جب اسے گاؤں کا خیال آیا تو کسی نے جیسے اس کو پکارا نہیں۔ جیسے کسی نے اس کا خیر مقدم نہ کیا ۔۔۔ اس کا فن ہی اسے آگہی کے اشارے سے اپنے پاس بلا

رہا تھا وہ اس کے قریب جاتا تو اس کا فن اس سے اور بھی دور نکل جاتا اور پھر اسے اشاروں سے اپنے پاس بلانے لگتا ــــ وہ اور آگے بڑھتا ــــ اس کا فن اس سے بھی آگے نکل جاتا ــــ جگدیپ اس کے پیچھے پیچھے مزید آگے بڑھتا گیا۔

دلی آکر جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے فن نے دھرتی پر اس کے لیے کوئی مقام پیدا کر دیا ہو ــــ تین کمروں کا ایک فلیٹ کرایہ پر لے کر جگدیپ نے وہاں اپنا سٹوڈیو بنایا ــــ اب اس کی لکیروں میں ایک لچک پیدا ہوتی جا رہی تھی ــــ رنگوں میں پیارے پیارے سپنے گھلتے جا رہے تھے ــــ اس نے اپنے دن اور اپنی راتیں اپنے فن کے حوالے کر دیں ــــ یہاں کئی فن کاروں سے اس کا واسطہ پڑا۔ کبھی اسے قدیم فنِ مصوری اپنی طرف کھینچتا اور کبھی وہ جدید آرٹ کی تکنیک پر غور کرنے لگتا۔ بحث ہوتی۔ غیر ممالک کے فن مصوری کی نمائش لگتی ــــ اس کی واقفیت کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔

اور پھر ایک حادثہ اس کی زندگی پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح ٹوٹا۔ ایک دن اس کے ایک دوست مصوّر نے اس سے کہا کہ اس کی واقف دو لڑکیاں ایک دو روز کے لیے اس شہر میں آ رہی ہیں۔ ان کی رہائش کا کوئی انتظام نہیں ہے اگر وہ ایک دو روز کے لیے اپنے فلیٹ کا ایک کمرہ دیدے تو وہ اس کا بیحد ممنون ہوگا۔

دوسرے دن رات کو دس بجے اس کا دوست اس کے پاس آیا ــــ اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں ــــ انہوں نے کمرہ کھولا اور وہ اس میں چلے گئے۔

جگدیپ نے اپنے نوکر سے ان کے لیے کھانا تیار کروا لیا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے گیارہ بج گئے ــــ دونوں لڑکیاں اور اس کا دوست کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

کوئی آدھ گھنٹہ چاروں مل کر تاش کھیلتے رہے اور پھر جگدیپ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

نہ جانے رات کے کتنے بجے تھے جب کسی نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا جگدیپ نے دروازہ کھول دیا — ان دو لڑکیوں میں سے ایک لڑکی اسکے کمرے میں آگئی —

جگدیپ ابھی تک اس سے کوئی سوال نہیں کر سکا تھا — لیکن اس لڑکی نے دروازہ اندر سے بند کر دیا اور بجلی بجھا دی۔

جگدیپ کی آواز جیسے اس کے حلق میں اٹک گئی — ایک تپلا اور نازک بدن اس کے بدن سے چمٹ گیا۔ پتلی پتلی باہیں اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھیں اور کسی کا سانس اس کے سانسوں کو چھو رہا تھا۔

جگدیپ کو یوں لگا جیسے اس کے ہوش اڑتے جا رہے ہوں۔ پانی کی ایک لہر نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا اور وہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کے پانی میں نہ جانے کس طرف بہتا چلا جا رہا تھا — کنارا کہاں رہ گیا تھا اور کتنی دور تھا — اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا — کسی نے جگدیپ کے ہونٹ اپنے ہونٹوں میں لیے ہوئے تھے۔

ایک اور لہر آئی — اس کے جسم کو ایک دھکا سا لگا — وہ اپنے پلنگ پر گر پڑا — اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے دریا میں سے نکال کر سمندر میں پھینک دیا تھا۔

اس کے ذہن میں جیسے بادل گرج رہے تھے — وہ اکیلا تھا — بالکل تنہا — بادل گرج رہے تھے — ایک طوفان اٹھا ہوا تھا — اس نے گھبرا کر کسی کو پکارنا چاہا۔

مگر اس نے دیکھا کہ بادلوں کی گھن گرج میں اسے اپنی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر بادلوں کی گرج میں بجلی چمک اٹھی — اس نے بجلی کی روشنی میں دیکھا کہ وہ کہاں تھا۔ وہی پلنگ تھا اور چھریرے بدن کی ایک نازک سی لڑکی اس کی قمیض کے بٹن کھول رہی تھی — اس نے تڑپ کر کہا:

"تم کون ہو — ؟"

"کون بھی ہوں — آج کی رات میں تمہاری ہوں۔"

"نہیں — نہیں — تم میری نہیں ہو — چلی جاؤ۔"

"کہاں جاؤں بابو — ؟"

"میں نہیں جانتا تم چلی جاؤ۔"

"یہ کیا مذاق ہے بابو — ؟"

"میں کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں — چلی جاؤ۔"

"مجھے بلوایا کیوں تھا — ؟"

"تمہیں کس نے بلوایا ہے — ؟"

"تمہارے دوست نے —"۔

"کون سا دوست — ؟"

"تمہارے دوست شنکر نے۔"

"شنکر کہاں ہے — ؟"

"ساتھ کے کمرے میں۔"

"تم اس کے پاس چلی جاؤ۔"

"اس کے پاس تو دوسری لڑکی ہے"

"میں کچھ نہیں جانتا —— کچھ نہیں جانتا"

"کیا میں اپنی آج کی رات تباہ کردوں ؟ میرے پیسے کون دیگا؟"

"کیسے پیسے ۔؟"

"شنکر نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے پچاس روپے ملیں گے"

"پچاس روپے ۔ کیسے پچاس روپے ۔؟"

"آج کی رات کے پچاس روپے"

"میں تمہیں پچاس روپے دیدوں گا ۔ لیکن تم یہاں سے چلی جاؤ"

لڑکی نے غصہ سے اپنے دونوں ہاتھوں کو زور سے مروڑا اور اس کے ہاتھوں میں

کوئی بھکارن ہوں —؟ لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا

جگدیپ اب اس کی سسکیوں کی آواز سن رہا تھا ۔

بجلی چمک کر غائب ہو چکی تھی ۔ لیکن غائب ہونے کے بعد تاریکی میں اور بھی اضافہ کر گئی تھی —— اس اندھیرے میں جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس کے پہلو کے ساتھ چمٹا ہوا سسک رہا تھا — جگدیپ نے سسکتی ہوئی اس لڑکی کو زور سے بھینچ لیا اور پھر خود کو اس کی آغوش کے حوالے کر دیا ۔

جگدیپ کی آنکھ کھلی تو شنکر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کے ہنس رہا تھا ۔

"صاحب — چائے پی لیجئے —— آج میں آپ کا بیرا بنا ہوا ہوں ۔

"تم ہو شنکر —؟"

"میں جانتا تھا صاحب کی یہی حالت ہو گی ___ اسی لیے میں نے نوکر کو چائے لیکر آنے نہیں دیا۔"

"شنکر۔"

"دیکھا تمہیں کیسا چونکا دیا۔"!

"چپ رہو شنکر۔"

"اتنا کیوں بنتے ہو یار ___ کتنی پُر لطف رات کٹوائی ہے۔"

جگدیپ سے اب کچھ نہ کہا گیا ___ شنکر نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔" پہلے تو تم نے اس لڑکی کو ڈرا ہی دیا تھا۔"

جگدیپ نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا ___ اس نے جھٹکے سے چادر ایک طرف ہٹا دی ___ پھٹی ہوئی قمیص گلے سے اتار کر نئی قمیص پہن لی۔

میز پر چائے پڑی ہوئی تھی ___ جگدیپ اسے ایک ہی سانس میں پی گیا۔ اور الماری میں سے سو روپیہ کا نوٹ نکال کر جگدیپ نے شنکر کے ہاتھ میں تھما دیا۔" شنکر اس وقت تم چلے جاؤ ___ فوراً چلے جاؤ ___"

جگدیپ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلا ___ تھوڑی سی دیر کے بعد ایک ٹیکسی کے رکنے کی آواز سنائی دی اور پھر ساتھ کے کمرے میں سب کے چلے جانے کا شور سنائی دیا۔

ایک لمبا سانس لے کر جگدیپ اٹھا اور اپنی الماری کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا ___ دیکھتا رہا ___ دیکھتا رہا ___ اور پھر جیسے آئینہ میں نظر آتے ہوئے چہرے کو وہ پہچان نہ سکا ___ وہ پھر ایک گہرا سانس لیکر آئینہ کے سامنے سے ہٹ گیا۔

جب سے رمندر نے نوراں کی تصویر کے ٹکڑے کیے تھے تب سے جگدیپ نے کئی تصویریں بنائی تھیں۔ لیکن ستارے جڑی پوشاک والی نوراں بنانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی تھی۔

تازہ حادثہ کے بعد جگدیپ کو اپنا آپ ایک اُگلا ہُوا نوالہ محسوس ہونے لگا۔ ایک ہی خیال تھا اور ایک ہی چہرہ تھا جس کے متعلق سوچتے ہوئے جگدیپ کو اپنا آپ پاکیزہ معلوم ہوتا تھا ـــــ اس تصویر کو دوبارہ بنانے کا جنون اس کے سر پر سوار ہو گیا۔

کئی برس ہوئے جب وہ آرٹ اسکول میں پڑھتا تھا اُس نے گاؤں میں اپنے مکان کے چوبارہ میں اپنے ادھورے اور ناپختہ فن کے ساتھ نوراں کا جو خاکہ بنایا تھا اسے ڈھونڈ کر نکالا اور اس کی بنیاد پر اپنے تصویر میں رنگ بھرنے لگا۔

تصویر بنتی چلی گئی ـــــ اس تصویر سے بھی کہیں زیادہ حسین تصویر جسے رمندر نے پھاڑ دیا تھا ـــــ جوں جوں تصویر مکمل ہوتی گئی توں توں جگدیپ کو اطمینان قلب نصیب ہوتا ہُوا محسوس ہوا ـــ اور جب تصویر کو فریم کروانے کے بعد جگدیپ نے اسے اپنے سٹوڈیو میں لٹکایا تو اس دن اسے یوں محسوس ہُوا جیسے اس کے ماتھے پر ہتھوڑے کی چوٹ کا نشان مٹ گیا ہو۔

۱۹۴۷ء کے آخر میں جگدیپ کا دل دلّی سے اُوب گیا۔

اجنتا ایلورا کے غاروں اور جنوبی ہند کے مندروں کی مورتیوں نے اسے پکارا۔

اپنے فلیٹ کے دو کمروں کو بند کر کے اس نے تیسرا کمرہ اپنے ایک دوست پریم کو رہنے کے لیے دیدیا اور آپ اپنے فن کے بلاوے پر نکل کھڑا ہوا۔

۱۹۴۷ء کا سال گزر گیا اور اب ۱۹۴۸ء بھی بیت رہا تھا۔ جب وہ دلی واپس آیا۔ اخباروں میں اس نے بہت کچھ پڑھا تھا — گاؤں سے جب بھی روپے آتے تھے تو چچا کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوتی تھی۔ پنجاب کے متعلق بہت کچھ لکھا ہوتا تھا لیکن جو کچھ اس نے دلی آکر دیکھا تھا وہ اس کی سوچ سے باہر تھا۔ مگر لوگ کہہ رہے تھے کہ زندگی اپنے اصل مقام آگئی ہے۔

وہ بار بار لوگوں کے مرجھائے ہوئے چہروں کی طرف دیکھتا — لکھ پتی کنگال ہو گئے تھے اور جو لوگ اپنے کنبوں کے افراد سے ہاتھ دھو کر آئے تھے اُن کے چہرے اس طرح تھے۔ جیسے ان کے انگ کٹ گئے ہیں اور اب وہ اپاہج بن کر اس دھرتی پر رینگ رہے ہوں — جگدیپ کو کبھی ۱۹۴۷ء کی تباہی عظیم نظر آتی اور کبھی اس تباہی سے خریدی ہوئی دیش کی آزادی پیاری معلوم ہوتی۔

جگدیپ نے اپنے سٹوڈیو کو دوبارہ سنوارا اور سجایا۔ گذشتہ برسوں میں فن پختگی سے اس کے ہاتھ مالا مال ہو گئے تھے۔ لیکن ابھی اس کا کام میں جی نہیں لگتا تھا — اس نے چچا کو خط لکھا کہ وہ چند روز کے لیے گاؤں آرہا ہے۔

چچی نے جگدیپ کی پیشانی چومتے ہوئے بڑے چاؤ سے کہا — "میں قربان جاؤں —"

جگدیپ کو ایک بار تو یوں محسوس ہوا جیسے وہ چودہ برس کے بن باس کے بعد اجودھیا واپس آیا ہو۔

"سناؤ چچی ـــــ تمہارا کیا حال رہا؟" جگدیپ نے بار بار پوچھا۔

"شاید تیرا منہ دیکھنے کے لیے ہی زندہ رہ گئی ہوں ـــــ ورنہ پنجاب کا جو حال ہُوا ـــــ توبہ ہی بھلی۔"

"کیا ہمارے گاؤں میں بھی کچھ ہُوا ـ ؟"

"تم عمر بھر نادان ہی رہو گے ـــــ ہمارے گاؤں میں دیوتا تو نہیں رہتے تھے۔"

"یہاں تو کیا ہندو کیا مسلمان سب بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔"

"سب جگہ بھائیوں کی طرح رہا کرتے تھے۔ مگر سب کے سروں پر بھوت سوار ہو گیا۔"

"کوئی بری بات تو نہیں ہُوئی ـــ ؟"

"کیا تو نے گاؤں میں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی بھی دیکھا ہے؟ نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ آ گئے ہیں ـــــ یہاں کے لوگ اُجڑ کر اُدھر جا بیٹھے ہیں اور اُدھر کے لوگ یہاں آ گئے ہیں۔"

اچانک جیسے کوئی اپنے قدموں میں سانپ دیکھ لے بالکل اسی طرح جگدیپ کو ایک خیال آیا اور اُس نے ڈرتے ہُوئے چچی کے منہ کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے دیپ ـــــ"

"چچی بیگماں ـــــ ؟"

"بیگماں بیچاری نہ جانے کہاں دھکے کھا رہی ہو گی ـــــ یہاں سے تو بال بچوں سمیت خیر و عافیت سے چلی گئی تھی ـــــ تیرے چچا اور دو آدمی اسے ساتھ کے گاؤں میں پہنچا آئے تھے ـــ اس سے آگے اگر تقدیر اچھی رہی ہو گی تو کسی نہ کسی ٹھکانے پر پہنچ گئی ہو گی ـــــ بھگوان کی باتیں بھگوان ہی جانے۔"

"بال بچے ۔؟"

"نوراں اور اس کا خاوند بھی مر ا تھے —— نوراں کے دو بچے تھے —"

"اچھا تو وہ یہاں سے جا چکے ہیں ۔"

"پاگل نہ ہو تو — یہاں رہ کر انہیں کیا اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا تھا؟ ایک دن تو وہ بمشکل بچے تھے — کسی نے ان کے گھر میں آگ لگا دی تھی ۔"

"آگ —؟"

"جا کر ذرا دیکھ تو سہی — مکان کھلا پڑا ہے — ہاں سچ —"

"کیا ہے چچی —"

"گھر کے پیچھے برگد کا جو پیڑ تھا وہ تو نے اور نوراں نے لگایا تھا ۔"

جگدیپ سے بولا نہ گیا ۔

"پچھلی دیوار جب گری تو برگد کا وہ پیڑ بھی گر لیا ۔"

جگدیپ کو یوں محسوس ہیسے اس کا رُواں رُواں کانپ رہا ہو ۔

"جاتے ہوئے نوراں میرے گلے سے لگ کر نہ پوچھ کتنا روئی — کہتی لگی گھر کے جلنے کا غم نہیں —— اب مجھے کون سا یہاں لوٹ کر آنا ہے ۔ لیکن کاش برگد کا پیڑ نہ گرتا —— وہ دیپ کی نشانی تھا ۔"

اب جگدیپ کے دل میں رُکا ہوا طوفان بہہ نکلا —— ازل سے نادان بچے کی طرح وہ چچی کی گود میں سر رکھ کر رونے لگا —— جگدیپ کو یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی عمر میں کبھی رویا بھی تھا — آج اسے یوں محسوس ہوا ۔ جیسے اس نے یہ طوفان اپنے دل میں برسوں سے رُکا ہوا تھا ۔

"یہ قیامت کسی ایک پر نہیں بیتی ہے دیپ ـــــ سب پر گزری ہے"۔
چچی بار بار دیپ کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتی اور کہتی ـــــ "جو لوگ اُدھر سے آئے ہیں اور جو کہانیاں وہ سناتے ہیں سن کر پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے ـــــ تیرے ماموں کی پہلے ہی جالندھر تبدیلی ہو گئی تھی۔ نہیں تو نہ جانے اس کا بھی کیا حال ہوتا۔ سنا ہے لاہور میں کچھ کم نہیں ہُوا۔

شام کو جگدیپ نے ہاتھ مُنہ دھویا ـــ چچی نے اسے کچھ کھلایا پلایا۔ جگدیپ کو ایسا محسوس ہُوا جیسے اس کے اندر کوئی چیز دم توڑ چکی تھی ـــــ کھانے کی بھوک اور زندہ رہنے کی بھوک ختم ہو چکی تھی۔

جگدیپ کے قدم رُک نہ سکے ـــ ایک موڑ سے گزر کر اس نے دوسرا موڑ پار کیا۔ اس نے بیگماں کے منہدم مکان کو پہچان لیا۔ اس منہدم مکان پر بھی چھپر ڈال کر کچھ لوگ وہاں رہ رہے تھے۔ وہ دروازے کے آگے سے گزر گیا اور پچھواڑے پہنچا ـــ پاگلوں کی طرح اس کا جائزہ لیتا رہا۔ جیسے کوئی کھوئی ہوئی سوئی ڈھونڈ رہا ہو۔

ماں کے ہاتھوں کی چھاؤں کی کسی کو ضرورت نہیں تو راں ـــــ نہ مسلمانوں کو ـــ نہ ہندوؤں کو ـــ اس کے دل میں بیٹھا ہُوا جیسے کوئی کہہ رہا تھا۔

سارے کشمیر میں گھوم پھر کر جگدیپ جب اچھابل پہنچا تو اس کے دل کو کچھ سکون نصیب ہوا ___ بہت سے لوگوں کو شاید یہاں زیادہ رونق نظر نہیں آتی تھی لہٰذا وہ آتے تھے اور چلے جاتے تھے لیکن جگدیپ کو یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ مقام اُسے اپنے قریب آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ بہت سے کمروں پر مشتمل ایک بلڈنگ تھی۔ تھوڑے سے کرائے پر اسے ایک کمرہ مل گیا تھا ___ کمرے کے سارے پردے گرا کر وہ کھڑکی کھول لیتا اور گھنٹوں وہاں کھڑا رہتا۔ کبھی اس کے جی میں آتا کہ وہ قدرت کی بھری ہوئی گود میں گم ہو جائے ___ اس کی وسعت میں کھو جائے۔ اس کی ہریالی سے ڈھانپ دیا جائے ___ کبھی اس سے اس قدر حسن و جمال برداشت نہ ہوتا ___ وہ پھولوں اور پتیوں کو چھو نہ سکتا۔ حسن کی وسعت سے جیسے ڈر جاتا اور کھڑکی میں بیٹھ کر اسے دور سے دیکھتا رہتا۔

ایک دن باغ کی جھیل کے کنارے بیٹھا ہوا جگدیپ کاغذوں اور رنگوں میں ڈوبا ہوا تھا ___ اسے جھیل کے پانی میں ایک پرچھائیں لرزتی ہوئی نظر آئی ___ ایک نہایت ہی حسین و جمیل بت تھا۔ جگدیپ کا جی چاہا وہ پیچھے مڑ کر دیکھے کہ وہ پرچھائیں کس کی تھی ___ اس کے بعد اُسے یوں محسوس ہوا کہ اُس نے اگر مڑ کر دیکھا تو پرچھائیں

والی لڑکی وہاں سے چلی جائے گی اور پھر پانی میں اس کی پرچھائیں نہیں پڑے گی ــــ اس کے سامنے پھیلی ہوئی جھیل ویران ہو جائے گی ــــ وہ اپنے کاغذوں پر جھکا رہا اور جھیل کے پانی اور جھیل میں لرزتی ہوئی پرچھائیں کو اپنے کاغذ پر اتارتا رہا۔

ہلکے ہلکے رنگ اس کے کاغذ پر پھیلتے جا رہے تھے ــــ جھیل کے پانی اور اس تیرتی ہوئی پرچھائیں کو جب اس نے کاغذ پر محفوظ کر لیا تو اسے اِس پرچھائیں کے گم ہو جانے کا خطرہ نہ رہا لہٰذا اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ــــ پھولوں کے لدے ہوئے درخت کے پاس ایک لڑکی کھڑی تھی۔

کسی تصویر کے رنگوں میں جیسے جان پڑ جائے ــــ وہ لڑکی اس کے تصوّر کی طرح حسین تھی۔ اس کی نگاہیں دور پیڑوں کے جھنڈ میں کھوئی ہوئی تھیں۔ پہلگام کے خیموں میں رہتے ہوئے اس نے بہت سے لوگ دیکھے تھے ــــ برتنوں کی کھنک اور پارٹیوں کی چہل پہل میں اس نے مسرور عورتیں دیکھی تھیں ــــ گھوڑوں پر لمبی سیر پر نکلی ہوئی خوش اور دلکش لڑکیاں دیکھی تھیں ــــ گل بوٹوں کے جھرمٹ میں تاش کھیلتی ہوئی اور ہنستی ہوئی دوشیزائیں رنگ برنگے کپڑے پہنے ہوئے گروہ بنا کر چلتی ہوئی عورتیں اور کشمیر کی سیر کو آئے ہوئے پریوار اس نے دیکھے تھے۔ مگر ان میں سے کوئی بات نظر نہیں آئی تھی۔

آج جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ لڑکی اس دھرتی کے رہنے والی نہیں تھی۔ گذشتہ ایک گھنٹہ سے وہ ویسے ہی وہاں بے خیالی کے عالم میں کھڑی تھی جیسے پھولوں کے باغ میں چپ چاپ پھولوں کی ایک اور بیل اُگ آئی ہو اور اپنے گرد و پیش میں اس طرح رچ گئی ہو کہ وہ باقی پھولوں سے الگ نہ ہو۔

دل میں غم و اندوہ کا طوفان لیے ہوئے جگدیپ اپنی جگہ پر بیٹھا رہا ــــ کبھی وہ

دوسرے پیڑوں کی طرح دیکھتا اور کبھی ایک پیڑ کی طرح اُگی ہوئی اس لڑکی کو دیکھتا اور پھر جگدیپ نے ایک نوجوان کو وہاں آتے دیکھا۔ اس نے لڑکی کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکی نے چونک کر اور مُسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ دونوں وہاں سے چلے گئے۔

جگدیپ نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی تصویر کو ٹٹولا وہ وہیں تھی۔ جگدیپ نے ٹکٹکی باندھ کر تصویر کی طرف دیکھا کاغذ پر جھیل کا پانی اور پانی میں لرزتی ہوئی پرچھائیں وہیں تھی کہیں چلی نہیں گئی تھی۔

رات کو جب جگدیپ اپنے کمرے میں سونے کے لیے آیا تو اس کی نگاہ باقی کمروں پر بھی پڑی۔ اِس کے کمرے سے تین کمرے چھوڑ کر جو کمرہ تھا اِس میں وہ لڑکی اور اس کا ساتھی وہ نوجوان جو شاید اس کا خاوند تھا قیام پذیر تھے۔

دوسرے دن باغ میں اس نے دو تین آدمیوں کو باتیں کرتے ہوئے سُنا۔

"ریکھا یہاں آئی ہوئی ہے — اس کے ساتھ اس کا خاوند بھی ہے"

جگدیپ نے ریکھا کا نام سُن رکھا تھا۔ اسے بہت کم ادیب پسند آئے تھے۔ کہانیوں سے زیادہ شعر و شاعری اس کے لیے زیادہ کشش رکھتی تھی۔ مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ جب کوئی نظم یا شعر اسے اپنی رگ و پے میں اترتا ہوا محسوس ہوا کرتا تھا — اسے اپنے ملک کے جو ادیب پسند تھے ریکھا ان میں سے ایک تھی — اس نے ریکھا کی کچھ کتابیں خرید کر بھی اپنے پاس رکھی ہوئی تھیں —" وہی ریکھا ہوگی ضرور وہی ہوگی جس لڑکی کو میں نے کل دیکھا تھا وہ ریکھا کے سوا کوئی دوسری لڑکی نہیں ہو سکتی — جگدیپ کا دل اس سے کہہ رہا تھا۔

اس دوپہر کو جگدیپ نے ریکھا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا ۔ ریکھا اپنے کمرے ہی میں تھی ۔ اس کا خاوند بھی وہیں تھا ۔ دونوں نے بڑے احترام اور تپاک کے ساتھ جگدیپ کو اندر آنے کی دعوت دی ۔

"میرا نام جگدیپ ہے ۔"

"جگدیپ ۔ مصور ؟"

"آپ نے کیا میرا نام سن رکھا ہے ؟"

"حیرانی اس بات پر نہیں ہے ۔ حیرانی تو جب ہوتی اگر نہ سنا ہوتا ۔"

"شکریہ ۔"

"کئی بار نمائشوں میں آپ کی تخلیقات بھی دیکھی ہیں ۔ چند روز کی بات ہے ایک اخبار نے آپ کی بنائی ہوئی کتنی ہی تصویریں شائع کی تھیں ۔

"آپ میرے پسندیدہ ادیبوں میں سے ہیں ۔ اس وقت بھی میرے کمرے میں آپ کی دو کتابیں پڑی ہوئی ہیں ۔"

"کیا اب میں آپ کا شکریہ ادا کروں ۔ ؟"

سب ہی ہنس پڑے ۔ جگدیپ کو ریکھا کا پتی بھی بہت اچھا لگا ۔ اس کے رویہ میں قطعاً بیگانگی نہیں تھی ۔ آنے سے پہلے جگدیپ جھجکتا رہا تھا ۔ ریکھا سے نہیں بلکہ اس کے خاوند سے ۔ لیکن وہ تو ریکھا سے بھی کہیں زیادہ بے تکلف تھا ۔ اس نے اپنے نوکر کو آواز دے کر چائے منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے جگدیپ کے لیے چائے کی پیالی بنائی ۔

"یہاں آپ کتنے دن رہیں گے ؟" جگدیپ نے ریکھا کے خاوند سے پوچھا ۔

ریکھا کو سارے کشمیر میں یہ جگہ بہت پسند آئی ہے ــــ ہمیں جتنے روز بھی رہنا ہُوا یہیں رہیں گے ــــ" ریکھا کے خاوند نے جواب دیا۔

جگدیپ کل والا خاکہ اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اگر یہ خاکہ دکھانا موزوں ہُوا تو دکھاؤں گا ورنہ واپس اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ لیکن جب یہ خاکہ دکھانے میں جگدیپ کو جھجک محسوس نہ ہوئی۔

"کل آپ جھیل کے کنارے بہت دیر تک کھڑی رہیں"؟

"ہاں ــــ وہاں کنارے پر کوئی شخص تصویریں بنا رہا تھا ــــ کیا آپ ہی تھے ــــ؟"

"آپ کی پرچھائیں پانی میں پڑ رہی تھیں ــــ میں نے ایک اسکیچ تیار کیا تھا"

جگدیپ نے کاغذ کھولا ــــ وہ کاغذ ریکھا کے پتی نے پکڑ لیا۔

"بہت پیارا ہے ــــ بہت ہی پیارا ــــ" اس نے کہا۔

"اِس میں ریکھا جی کو پہچانا نہیں جاتا ــــ صرف ایک پرچھائیں ہے"

"پرچھائیں زیادہ خوبصورت ہُوا کرتی ہے ــــ ریکھا کا پتی بولا۔

"آپ اگر اجازت دیں تو میں کسی دن ان کا اسکیچ بنا دوں"

"ضرور ــــ ضرور ــــ"

چائے ختم ہوگئی ــــ جگدیپ جب وہاں سے چلنے لگا تو ریکھا نے کہا ــــ یہاں کشمیر آکر آپ نے بہت سی تصویریں بنائی ہوں گی ــــ کسی دن وہ دکھائیے ــــ؟"

"جس دن آپ کا جی چاہے ــــ آپ نے کمرے سے چوتھا کمرہ میرا ہے۔

دوسرے دن اور پھر اس سے اگلے دن ریکھا اور اس کا پتی اس کے کمرے میں

آگئے۔ جگدیپ نے ریکھا کا اسکیچ تیار کر دیا ۔۔۔ سادہ سی پنسل ڈرائنگ تھی اور پھر جگدیپ نے کہا "میں کچھ دن صرف کر کے آپ کی رنگین تصویر بناؤں گا۔"

"میری تصویر بنانے کی بجائے ۔۔۔"

"ہاں ہاں کہیے ۔۔۔"

"بہت بڑی بات معلوم ہوتی ہے۔"

"آپ کہیے تو سہی۔"

"اگر آپ میرے کسی گیت کے چند مصرعوں کو ۔۔۔"

"جو مصرعے آپ کو پسند ہوں میں ان کے متعلق بھی تصویر بنا دوں گا۔"

اور پھر ایک روز ریکھا نے جگدیپ کے کمرے میں آ کر کہا ۔۔۔ "آج مجھے اپنی ساری تصویریں دکھایئے ۔۔۔ بشرطیکہ آپ کے پاس وقت ہو ۔ ۔ ۔ ۔"

"وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟"

"رات کو تار آیا تھا اور وہ چار پانچ روز کے لیے جموں چلے گئے ہیں۔"

"آپ اکیلی رہیں گی۔؟"

"ڈر کی کوئی بات نہیں ۔۔۔ پرانا نوکر پاس ہے ۔۔۔ بہت ہی بھلا آدمی ہے۔

اور پھر چار پانچ روز تک وہ بھی لوٹ آئیں گے ۔"

"میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ۔۔۔"

"آپ نزدیک ہی تو رہتے ہیں ۔۔۔ اگر کوئی ضرورت ہوئی تو ۔۔۔"

جگدیپ نے اپنا سوٹ کیس کھولا ۔ کئی تصویریں تو باہر ہی پڑی تھیں سارا کمرہ کاغذوں سے بھرپڑا تھا ۔ میز پر کاغذ ۔ کرسیوں پر کاغذ ۔ پلنگ پر کاغذ ۔ ایک تصویر جگدیپ نے دیوار پر لٹکا رکھی تھی ۔۔۔ یہ سب تصویریں ریکھا نے دیکھ رکھی تھیں ۔۔۔ آج جگدیپ اسے سوٹ کیس میں حفاظت سے رکھی ہوئی تصویریں دکھانے لگا ۔۔۔!

"دیوار پر ٹنگی ہوئی یہ تصویر جس کے نیچے "سپنا" لکھا ہوا ہے کس کی ہے ۔؟"

جگدیپ نے اس سوال کا فوراً جواب نہ دیا ۔ کچھ سنبھل کر بولا ۔۔۔ "نوراں کی ہے ۔"

"کون نوراں ۔۔۔ کہاں تھی ۔۔؟"

ریکھا جیسی لڑکی کو یہ پوچھنے کی ضرورت نہ تھی ۔۔۔ جگدیپ کی جھکی جھکی نگاہوں نے جو داستان سنائی ریکھا نے وہ سن لی ۔

"کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ تحریر کا ذریعہ اظہار بہت بیگانہ سا ہے ۔"

"مکمل تو کوئی بھی ذریعہ اظہار نہیں ۔۔۔ آپ اپنے باطن سے چاہے کتنا ہی کچھ کیوں نہ باہر نکال لائیں ۔۔۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بات بنی نہیں ۔"

"یہی تو ایک بات ہے جو بار بار لکھنے پر مجبور کرتی ہے ۔۔۔ بار بار ارتقا کا تقاضہ کرتی ہے ۔۔۔ لیکن لفظوں کا سہارا بہت ہی بیگانہ معلوم ہوتا ہے اور بہت ہی ۔"

"کچھ تحریریں ایسی بھی ہوتی ہیں جو آدمی کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں"

"مجھے اپنے کسی کسی مصرعے پر بہت اطمینان ہوتا ہے لیکن کبھی بالکل اطمینان نہیں ہوتا ـــ جیسے لفظوں کی گرفت میں کچھ بھی تو نہ آ رہا ہو"

"آپ نے ایک دن کہا تھا کہ ہیں آپ کے چند مصرعوں کی ـــ آپ کو کونسے مصرعے پسند ہیں ـ؟"

"ایک بھی پسند نہیں ـــ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی نہ لکھوں ـــ لکھنا مجھے ـــ"

"آپ کیا کہنے والی تھیں ـــ؟"

"کچھ نہیں"

ناقابل شکست سکوت مسلط ہو گیا ـــ پھر جگدیپ کو ایک سہارا ہاتھ لگا اور اس نے کہا ـــ "آپ کا وہ مصرعہ ـــ

دل میں دیا جلا کر کوئی جب بھی سانس لیا کرتا ہے ـ؟"

"اس میں تصویر سے خطاب کیا ہے"

"ہاں ـــ"

"ہماری دنیا میں تصور کے کوئی معنی نہیں ہیں ـ دنیا پہاڑے کی طرح ہے جسے کوئی بھی پڑھ سکتا ہے ـــ لیکن تخلیق کے معنی کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی ناپے جا سکتے ہیں"

مگر ہم دو پاگل ہو گئے ہیں ـــ تصور کے سہارے ہی جیئے جاتے ہیں"

جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے دل کا طوفان کبھی رکا نہیں تھا ـــ اس

کے بدن کو اس طوفان کے تھپیڑے لگتے رہے تھے۔ لیکن کبھی کبھی جب وہ کوئی تصویر بناتا تھا تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ طوفان پر کوئی پل بن گیا ہے۔ جس پر کھڑا ہو کر وہ سیلاب کی وسعتوں کو دیکھ سکتا تھا اور تھوڑی دیر کے لیے لہروں کے تھپیڑوں سے بچ سکتا تھا۔

لیکن اس وقت جگدیپ کو یوں لگا کہ اس کے فن کا پل بھی ٹوٹ گیا ہے اور پانی کی لہروں میں اس کے پاؤں اکھڑ رہے ہیں ___ ریکھا نے یہ کیا کہا تھا ___ تخیل آپ کے دل میں ایک سوال رکھ دیتا ہے جس کا جواب شاید کوئی نہیں ہوتا ___ جگدیپ سوچا کرتا تھا کہ یہ سوال جیسے اس کے دل ہی میں کھٹکتا رہا تھا۔ صرف اس کے دل میں کھٹکتا رہا تھا ___ آج اسے پتہ چلا کہ یہ سوال ریکھا کے دل میں بھی کھٹک رہا تھا اور پھر نہ جانے اس جیسے اور ریکھا جیسے کتنے اور لوگ بھی تھے جن کے دلوں میں یہ سوال کسمسا رہا ہو گا اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے وہ شعر کہتے ہوں گے۔ کسی کو بھی اس سوال کا جواب نہ ملتا تھا ___ کوئی بھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا تھا ___ یہ سوال کہاں سے دل میں آتا تھا ___ کہاں سے پیدا ہوتا تھا ___ یہ سوال کہاں سے وجود میں آتا تھا اور کیوں آتا تھا ___

"مجھے کچھ کہنا نہیں آتا ___ صرف سوچنا آتا ہے ___ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں ___ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں جو کچھ سوچتا ہوں آپ وہی کچھ کہتے ہیں ___ یہ سوال ہمارے دلوں میں کیوں پیدا ہوتا ہے ___؟"

"مجھے آج تک پتہ نہیں چلا ___ میں جو کچھ پڑھتی ہوں ___ میں جو کچھ لکھتی ہوں ___ یہ سوال اور بھی بڑا ہوتا جاتا ہے اور مجھے اس کا جواب نہیں ملتا ___"

"لوگ آپ جیسے ادیبوں کے لیے ہی تو کہتے ہیں کہ آپ کے پاس زندگی کے مسئلہ کا حل ہوتا ہے ۔۔۔!"

یہ "حل" کا لفظ مجھے مذاق معلوم ہوتا ہے ۔۔۔ میں جوں جوں دیکھتی ہوں میرے دل کا خلا بڑھتا جاتا ہے ۔۔۔ ہر لمحہ طویل ہوتا جاتا ہے ۔۔ جیسے سارے الفاظ اور ساری باتیں آپ کے گرد شور مچا رہی ہوں ۔۔۔ آپ کی شہرت اور آپ کی مقبولیت بھی آپ کو محض ایک غل غباڑہ نظر آتی ہے ۔۔"

ریکھا جیسے ہانپ گئی تھی ۔۔۔ وہ تمام تصویروں کو الگ رکھ کر کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی تھی اور اس کی نظر سامنے درختوں کے جھنڈ میں کھوئی ہوئی تھی ۔

"مجھے آپ اپنی ایک ایسی چیز سنایئے جو آپ کو کبھی کبھی اچھی معلوم ہوتی ہو ۔۔۔" جگدیپ نے بہت دیر کے بعد ریکھا کے پاس کھڑکی میں آ کر کہا ۔

"دو چار مصرعے ہیں ۔۔۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ان میں کوئی بات کہی ہے ۔"

جگدیپ خاموش رہا اور ریکھا نے آہستہ سے یہ مصرعے پڑھے :

یہ میری شب بیدار ہے اور یاد تیری سو گئی

سورج کا رتھ بیچ میں ٹوٹا کرنیں کسی نے لوٹ لیں

پھینکا کسی نے چاند کا گوٹا فلک سے نوچ لیا

یہ میری شب بیدار ہے اور تیری یاد سو گئی

اس کے بعد نہ جگدیپ سے اور نہ ہی ریکھا سے کچھ کہا گیا ۔ نہ جانے کتنے لمحے گذر گئے ۔۔۔ جگدیپ نے ایک بار صرف اتنا کہا ۔ "میرے پاس الفاظ نہیں ہیں ۔۔۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا ۔"

اس رات کو جب جگدیپ اپنے کمرے میں تھا تو اس پر نیند طاری تھی۔ لیکن اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بیدار ہو ——— سامنے چاندنی چھٹکی ہوئی تھی ——— چاندنی کا ایک بت تھا اور اس کی شکل ایک پیڑ کی طرح تھی ——— پھر اس درخت سے جیسے ایک ٹہنی ٹوٹ کے گر پڑی ——— اس جگہ اندھیرا ہو گیا ——— پھر دوسری ٹہنی گری اور پھر تیسری۔ دیکھتے ہی دیکھتے چاندنی کی ٹہنیاں ٹوٹتی چلی گئیں ——— تاریکی بڑھتی گئی اور پھر اندھیرے میں ایک سیاہ اور دیو قامت پیڑ اس جگہ کو ڈراؤنا اور بھیانک بنانے لگا۔ پھر جگدیپ نے دیکھا اس کے سامنے حسین اور نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا چاند پر بھرپور جوبن تھا ——— اور پھر کسی نے اپنے ناخنوں سے چاند کو نوچنا شروع کر دیا ——— جگدیپ نے گھبرا کر کمرے کی بتی روشن کر دی ——— وہاں اس کے چاروں طرف رنگ برش اور کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ نہ ٹوٹی ہوئی کرنیں تھیں اور نہ ادھڑا ہوا چاند تھا ——— جگدیپ نے ریکھا کا جو سکیچ بنایا تھا اس کی طرف دیکھا ——— وہ ایک خاموش سیدھی سادی گمبھیر لڑکی تھی ——— کون جانے اُس نے سورج کے رکھ سے کرنیں ٹوٹتی ہوئی دیکھی ہوں۔ اور کون جانے اُس نے آسمان کی پوشاک پر سے چاند کا گوٹا کنارہ ادھڑتا ہوا دیکھا ہو۔ جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دل کا سوال پھیل کر بڑا ہو گیا تھا ——— اور بھی بڑا ہو گیا تھا۔

پانچ روز گزر گئے ——— ریکھا کے خاوند کا تار آیا کہ وہ اتنا مصروف ہے کہ واپس نہیں آ سکتا۔ اس لیے وہ نوکر کے ہمراہ جموں چلی آئے۔

ریکھا نے جب اپنا سامان باندھا جگدیپ نے آ کر کہا ——— سری نگر سے بس پکڑنے میں آپ کو کوئی تکلیف تو نہ ہو گی ——— ؟ اگر اجازت دیں تو میں آپ کو سری نگر تک چھوڑ آؤں۔"

"اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو —" ریکھا نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا۔

جگدیپ ریکھا کو چھوڑنے کے لیے سری نگر چلا گیا۔

سری نگر پہنچ کر پتہ چلا کہ بسوں کی آمد و رفت بند تھی — بارش سے اُدھر سڑک ٹوٹ گئی تھی۔

جگدیپ نے ایک نہایت اچھے ہاؤس بوٹ میں ریکھا کی رہائش کا انتظام کر دیا اور ایک چھوٹا ہاؤس بوٹ آپ لے لیا۔ پتہ چلا کم سے کم تین دن تک آمد و رفت نہیں کھل سکے گی۔

اس رات کو جگدیپ اپنے ہاؤس بوٹ میں سویا پڑا تھا تو اس نے دیکھا کہ ریکھا اُس کے پلنگ سے تھوڑی دور کھڑی ہے — ریکھا کا چہرہ حسین تھا اور وہ ایک دیوی نظر آ رہی تھی — ریکھا کی آنکھوں میں نہ جانے کیا بات تھی — وہ اس سے آنکھیں چار نہ کر سکا — اس نے لجاجت آمیز لہجہ میں کہا "بیٹھ جائیے" ریکھا خاموش رہی — بدستور اپنی جگہ پہ کھڑی رہی — اور پھر ریکھا کی دھیمی سی آواز سنائی دی — "میں نوراں کیسے بن جاؤں —؟"

جگدیپ چونک پڑا اور اٹھ بیٹھا — کتنا انوکھا خواب تھا — اس رات کو جگدیپ پھر سو نہ سکا۔

دوسرے دن جگدیپ جب ریکھا سے ملا تو وہ اپنے اچنبے پر قابو پا چکا تھا ریکھا کے ساتھ بیٹھ کر اُس نے کھانا کھایا اور پھر وہ باقی دن گذارنے کے لیے شکارے میں بیٹھ کر ڈل کے کنارے آ گئے اور ایک باغ میں چلے گئے۔

باتیں کرنے کی جیسے ضرورت ہی ختم ہو چکی تھی — یا ضرورتیں اتنی بڑھ گئی تھی کہ

باتیں کرنا یا نہ کرنا ان کے لیے ایک ہی بات تھی ـــــ کافی دیر تک دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی ـــــ ریکھا کو بیٹھنے کے لیے زرد پھولوں والے پیڑ کی چھاؤں بھلی معلوم ہوئی۔

"یہاں بیٹھ جائیں۔؟"

"ہاں ـــــ"

"کیا آپ پہلے بھی اس جگہ آئے ہیں۔؟"

"مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں آج سے پہلے کہیں بھی نہیں گیا ـــــ" جگدیپ نے سنجیدگی سے کہا ـــــ ریکھا نے ایک بار اس کی طرف دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ کہا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے آپ تھک گئے ہیں ـــــ ذرا آرام کر لیجیے ـــــ ریکھا نے کافی دیر کے بعد کہا۔

ریکھا کے نیچے جیسے زرد پھولوں کا قالین بچھا ہوا تھا ـــــ جگدیپ نے درخت کے تنے سے اپنی پیٹھ لگا دی اور کہا:

"ہوا سے کوئی نہ کوئی پھول ٹوٹ کر گر پڑتا ہے ـــــ میرا جی چاہتا ہے اتنے پھول گریں میں ان میں دفن ہو جاؤں ـــــ پھولوں کی ایک قبر بن جائے اور میں قبر میں سویا رہوں۔"

ریکھا خاموش رہی ـــــ پھول گرتے رہے ـــــ جگدیپ پر بھی اور ریکھا پر بھی۔

دوپہر کی دھوپ میں شام کا اندھیرا گھل گیا۔

"کیا چلیں ـــــ؟"

"چلو ــــ"

گھنٹوں کے بعد ان دونوں نے ایک دوسرے کی آواز سُنی ـــ

بارہ دری کی پتھر سے بنی ہوئی دیواروں کو لوگوں نے کھرچ کھرچ کر اپنے نام کندہ کر دیے تھے ـــ جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے نگاہوں کے قدموں میں کنکر آ گئے ہوں ـــ!

"اِس طرح اپنا نام لکھنے میں شاید کسی کو اطمینان ہوتا ہو ـــ" جگدیپ نے کہا۔ بیچارے لوگ ـــ دلوں کی دیوار پر نام کندہ نہیں کر سکتے ـــ زمانہ کی دیوار پر نام ثبت نہیں کر سکتے ـــ جھوٹی تسلیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں ـــ"

ریکھا نے آہستہ سے کہا ـــ باغ سے لوٹتے ہوئے ریکھا سرو کے ایک پیڑ کے پاس کھڑی ہو گئی ـــ سرو کے پتوں کو کافی دیر تک اپنی مٹھی میں رکھنے کے بعد انہیں چھوڑ دیا ـــ ان پتوں سے لگے ہوئے سبز سبز دانے توڑ کر اپنی دونوں مٹھیاں بھر لیں ـــ باغ سے باہر آنے پر ریکھا نے اپنی مٹھیاں جگدیپ ہتھیلیوں پر انڈیل دیں ـــ جگدیپ نے سارے دانے اپنی جیبوں میں ڈال لیے۔

ریکھا کو اس کے ہاؤس بوٹ میں چھوڑ کر اور کھانا کھا کر جگدیپ جب اپنے ہاؤس بوٹ میں آیا تو اس نے جیب سے سارے دانے نکال کر میز پر رکھ دیے اور پھر نہ جانے اسے کیا خیال آیا اس نے اپنے سوٹ کیس میں سے سُوئی اور دھاگا نکالا اور ان کی ایک مالا بنا دی۔

•

دوسرا دن ریکھا اور جگدیپ نے جس باغ میں گزارا اس کے کنارے بارہ دری کا ایک گوشہ ابھی تک ثابت کھڑا تھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر جب ریکھا اور

جگدیپ اوپر گئے تو اس کا ایک گوشہ ایک چھوٹی سی کھڑکی کی طرح تھا ـــ اس کھڑکی میں کھڑے ہو کر جگدیپ چونک پڑا ـــ گزشتہ رات کو جگدیپ نے خواب دیکھا تھا کہ ایک گھنے جنگل میں ایک چھوٹی سی جھونپڑی ہے ـــ سرکنڈوں کی چھت اور مٹی سے لیپی پوتی ہوئی دیواریں ـــ وہ اور ریکھا دونوں اس جھونپڑی میں کھڑے ہو کر ارد گرد پھیلے ہوئے گھنے جنگل کو دیکھ رہے تھے۔ جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا کہ ٹوٹے ہوئے پتھروں کی اس بارہ دری کا یہ گوشہ ایک جھونپڑی تھا جہاں وہ ریکھا کے پاس کھڑا ہوا گھنے جنگل کی طرف کو دیکھ رہا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو ـــ" ریکھا نے آہستہ سے پوچھا ـــ

"آج مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں ایک ہی دن میں سن رسیدہ ہو گیا ہوں"۔ جگدیپ نے اس کے سوا کچھ نہ کہا۔

اس شام کو جب ریکھا اور جگدیپ واپس آئے تو ان کا کہیں بیٹھ کر چائے پینے کو جی چاہا۔

ایک اچھا ہوٹل نظر آیا ـــ اندر گئے ـــ ان کی خواہش تھی کہ ہوٹل میں زیادہ بھیڑ نہیں ہونی چاہیئے ـــ کمرے میں لوگوں کا ہجوم تھا ـــ ایک طرف میز خالی پڑی تھی ـــ وہ اس کے گرد جا بیٹھے ـــ چائے ابھی تک نہیں آئی تھی۔ لیکن لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف پہلے ہی آ گئی تھیں۔

جگدیپ اور ریکھا نے لاکھ کوشش کی کہ انہیں چائے کی پیالیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئے لیکن آپس میں باتیں کرتے ہوئے بھی انہیں کوئی نہ کوئی دبی دبی آواز سنائی دے رہی تھی ـــ "ریکھ ـــ شاعرہ ـــ" اور اپنے خیالات میں محو۔ جگدیپ اور ریکھا

کو لوگوں کی نگاہیں اپنے بدن پر چبھی ہوئی محسوس ہوتیں۔

چائے کی پیالی ختم ہوتے ہی ریکھا اٹھ کر کھڑی ہو گئی ــــ جگدیپ نے اپنی پیالی آدھی خالی چھوڑ دی ــــ چائے کا بل ادا کیا اور وہ دونوں باہر آ گئے۔

شکارے میں بیٹھ کر جب وہ دونوں ہاؤس بوٹ میں واپس آئے تو ریکھا نے کہا ــــ "عورت ہونا بھی ایک مصیبت ہے ــــ بہت بڑی مصیبت"

اگلے روز ریکھا کو وہاں سے چلے جانا تھا ــــ اس رات کو جگدیپ سو نہ سکا ــــ ذرا سی دیر کے لئے آنکھ لگتی تو اسے ریکھا کا چہرہ دکھائی دینے لگتا اور پھر دیکھتے دیکھتے اس کا چہرہ نوراں کے چہرے میں تبدیل ہو جاتا ــــ جگدیپ چونک کر آنکھیں کھول کر دیکھتا ــــ اٹھ کر کافی دیر تک ہاؤس بوٹ کی بیس کھڑا رہتا۔ باہر ڈل کا پانی بھی پرسکون نہیں تھا ــــ جیسے اس کے پیروں کو ٹکنے کے لئے جگہ نہ مل رہی ــــ جگدیپ پھر اپنے پلنگ پر آ جاتا ــــ ذرا سی دیر کو آنکھ لگتی ــــ نوراں کا بھولا اور معصوم چہرہ اس کے سامنے آ جاتا اور پھر اس کے معصوم چہرے پر ویران متانت پھیل جاتی۔ اور وہ چہرہ ریکھا کا بن جاتا۔

صبح ہوئی تو جگدیپ ریکھا کے ہاؤس بوٹ میں پہنچا ــــ ریکھا اپنا سامان باندھ رہی تھی۔

"کیا میرا اسکیچ مجھے نہیں دیجیے گا ــــ؟" ریکھا نے کہا۔

"میں ساتھ لے کر آیا ہوں"

"اور وہ دوسرا ــــ؟"

"کون سا ــــ؟"

بیل اور پرچھائیں والا۔"

"پرچھائیں میرے پاس ہی رہنے دیجیے۔"

ریکھا خاموش ہو گئی ـــــ سامان سمیٹتی رہی ـــــ نوکر نے میز پر چائے رکھ دی۔ ریکھا نے دو پیالیاں بنائیں اور پلیٹ میں بھنے ہوئے بادام ڈال کر کہنے لگی ـــــ "زندگی کی چنگاری بڑی ظالم ہوتی ہے۔"

"سارا فن اسی باطنی چنگاری سے بیدار ہوتا ہے۔"

"جیسے زندگی کو فن عزیز ہو اور انسان عزیز نہ ہو۔"

"شاید ـــــ"

انسان چاہے ساری عمر اس چنگاری سے جلتا رہے۔ زندگی فن کی تعمیر کرتی رہتی ہے ـــــ کون جانتا ہے کہ انسان کو فن کی کتنی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے ـــــ اس بات کا علم ہوتا ہے کہ دھوپ سے چمکتی ہوئی ریت پانی نہیں ہوتی لیکن زندگی ریت ہی کو پانی کی طرح جھلکا دیتی ہے۔ انسان کے پیچھے دوڑنے لگتا ہے ـــــ" ریکھا نے چائے کی دوسری پیالی بناتے ہوئے کہا ـــــ "کل رات کو مجھے ایسا دکھائی دیا جیسے ریگستان میں چنبیلی کے پھول کھل اٹھے ہیں۔

ہر طرف سفید کلیاں ـــــ جدھر بھی نگاہ اٹھے ـــــ دودھ جیسے سفید کلیاں دکھائیں دیں ـــــ اور میں نے کلیاں توڑ توڑ کر اپنی جھولی بھر لی ـــــ اور پھر مجھے دکھائی دیا ـــــ بہت کچھ دکھائی دیا ـــــ بس صبح کو اٹھ کر لکھتی رہی ـــــ" ریکھا نے ایک کاغذ جگدیپ کے ہاتھ میں دے دیا۔

جگدیپ نے پڑھا۔

ورنہ اپنا بند کر اے زندگی

جذبِ دل کی لاج رکھ !

رتیلے میدان سے آتی ہوئی

سن ذرا آوازِ پا سن تو سہی

زندگی اپنا نہ درد تو بند کر

کر رے ایک پل کیلئے ہی انتظار

لاکھ اندھیرے پار کرتی چیرتی

آ رہی ہے روشنی کی ایک لکیر

ورنہ اپنا بند کر اے زندگی !

غیب خ سے آویزاں ہے، ایک جھونپڑی سی

انجم تاباں جلاتے ہیں الاؤ !

چاند کے لب پر صلائے عام ہے

درد اپنا بند کر اے زندگی

دیکھ تو مڑ کر ذرا تو ایک بار

ماتھے پہ کرنوں کا سہرا باندھ کر

آ گیا پھر آفتاب نو نگار

درنہ اپنا بند کر لے زندگی

ایک لمحہ کے لیے اب رک بھی جا

عشق ہاتھوں میں ہے ایک کاسہ لیے

زندگی تو بھیک اس میں ڈال دے

جگدیپ کا سر جھک گیا ـــــ وہ ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کاغذ تک سرنگوں ہو گیا ۔

نوکر نے میز پر سے خالی پیالیاں اٹھا لیں ـــــ رخصت کی گھڑی آ گئی تھی۔

کیا میں اسے رکھ لوں ـــــ ؟ جگدیپ نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ طرف دیکھ کر کہا۔

"ہاں ــــ" ریکھا نے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا۔

"یہ میرے لیے زندگی کا پیغام ثابت ہو گا"

"زندگی کا ہر ایک پیغام ایک فریب ہوتا ہے ـــــ ایک چھلاوہ ـــــ"

اس کے بعد دونوں خاموش رہے ـــــ ہاؤس بوٹ کا کرایہ ادا کرنے کے بعد ریکھا اور جگدیپ لاریوں کے اڈہ پر آ گئے ـــــ ریکھا کے لیے جگدیپ نے سیٹ ریزرو کروا رکھی تھی ـــــ لاری چلنے کا وقت ہو گیا اور جب چل دی تو سڑک پر اُڑتی ہوئی دھول دیکھ کر جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے آج دوسری بار وہ نوراں کو گم کر بیٹھا تھا ـــ!

اب کے جگدیپ نے چچی سے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ کشمیر سے لوٹتا ہُوا گاؤں آئے گا اور پھر دلّی جائے گا — چچی نے اُس سے کہا تھا۔

میری ویراں سے ملاقات ہُوئی تھی — وہ کسی کی شادی پر یہاں آئی ہوئی تھی — تجھے بہت یاد کرتی تھی۔"

"کیا خوش تھی —؟"

"بہت — اس پر تو جیسے دوبارہ شباب آگیا ہے۔"

"سچ —!"

"کہتی تھی — میں دیپ کا احسان نہیں چکا سکتی — اس نے تو مجھے نئی زندگی دیدی ہے۔"

"کیا روپے پیسے سے اس کا ہاتھ تنگ تو نہیں تھا؟"

"نہیں — کہتی تھی کہ انہوں نے پڑوس کے گاؤں میں کافی زمین خریدی ہے۔ ہیروں جیسے دو بیٹے ہیں اس کے — تجھے رہ رہ کر یاد کرتی تھی اور کہتی تھی دیپ سے کہنا کہ ایک بار مجھے آکر منہ تو دکھا جائے۔"

"اچھا چچی کبھی ہو آؤں گا۔"

اس وقت تو نوراں کے غم نے اسے کہیں نہ جانے دیا — اب کشمیر سے لوٹتے ہوئے جگدیپ کو اپنا وعدہ یاد آیا اور وہ اپنے گاؤں چلا آیا۔

جگدیپ چار پانچ روز کے لیے اپنی چچی کے پاس رہا اور پھر پھوپھی شاہنی کے گاؤں کا پتہ پوچھ کر وہ اس سے ملنے کے لیے چلا گیا۔ اِدھر اُدھر سے پوچھتے ہوئے اُس نے اس کا گھر ڈھونڈ لیا۔

"میں قربان جاؤں —— میرا دیپ —!" شاہنی کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔"

"خیریت تو ہے شاہنی —؟"

"مجھے شاہنی کہہ کر کیوں بلا رہا ہے — میں تو تیری ویراں ہوں —— وہی ویراں ——"

"تو سچ مچ شاہنی ہے ویراں —— آدمی دل سے دولت مند ہوتا ہے۔"

"میں تو بھکارن تھی دیپ —— تو نے سیٹھانی بنا دیا۔"

ویراں نے دالان میں نواڑی پلنگ بچھا دیا —— اندر سے نئی اور کوری چادر بچھانے کے لیے نکال لائی۔

"تو نے تو مجھے بھلا ہی دیا دیپ ——!" ویراں دودھ کا گلاس لائی اور جگدیپ کے قریب آ کر بولی۔

"اتنی دور سے تجھے ملنے آیا ہوں —— بھلا کیسے دیا —؟"

"سنا ہے اب تو بہت بڑا آدمی بن گیا ہے۔"

"ناپ کر دیکھ لو کہ میں کتنا بڑا ہو گیا ہوں۔"

"تو تو ویسا ہی دیپ ہے ــــ میں سوچتی تھی کہ اب تو ہم سے بات کرنا بھی گوارا کرے گا کہ نہیں۔"

"کیوں مجھے اب کیا ہو گیا ہے۔"

اب تو اخباروں میں تیری تصویریں چھپتی ہیں ــــ ہمارے گاؤں میں بھی اخبار آتا ہے ــــ جب میں نے پہلی بار تیری تصویر دیکھی تو سب کو دکھاتی پھری "میرا دیپ ــــ میرا دیپ ــــ!" میں نے بڑی حفاظت سے ٹرنک میں رکھی ہوئی ہے۔"

"سچ جگدیپ ہنس پڑا۔

"میں پوچھتی ہوں کیا اب تو شادی نہیں کرے گا ــــ؟ کیا بوڑھا ہو کر بیاہ کرائیگا"

"مجھ سے کوئی شادی کرواتا ہی نہیں۔"

"رہنے بھی دے ــــ تجھے باتیں بہت آتی ہیں ــــ یوں کیوں نہیں کہتا کہ کوئی لڑکی تیری نظر پر چڑھتی ہی نہیں۔"

"سچ کہہ رہا ہوں نظر پر تو چڑھتی ہیں ــــ مگر"

"مگر کیا ــــ؟"

"وہ لڑکیاں یا تو کسی اور سے بیاہ کر لیتی ہیں یا کسی نے پہلے ہی سے شادی کر رکھی ہوتی ہے ــــ" جگدیپ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"تو باتیں بہت بناتا ہے ــــ شہر میں رہ کر تجھے بہت باتیں آ گئی ہیں۔"

"تجھے بھی تو آ گئی ہیں ــــ پہلے تو بات نہیں کیا کرتی تھی۔"

"چل ہٹ ــــ" ویراں شرما گئی۔

"بچے کہاں ہیں۔؟

"تجھے یہ کس نے بتایا کہ ــ" ویراں حجاب کے مارے سُرخ ہوگئی۔

"اچھا یہ تو بتا تیرے بچے رشتہ میں میرے کیا ہوئے۔!" جگدیپ نے از راہِ مذاق پوچھا۔

"میں نے تیری تصویر انہیں دکھائی تھی اور کہا تھا یہ تمہارا ماموں ہے ــ" ویراں کی ہنسی نکل گئی۔

"کون سے رشتے میں ان کا ماموں ہوا ــ؟" جگدیپ نے آہستہ سے ویراں کی پیٹھ پر مکے مارتے ہوئے کہا۔

"چل بیٹھا بھی رہ ــ" ویراں ہنسی کے مارے دُوہری ہوئی جارہی تھی۔

"اچھا انہیں دکھا تو سہی ــ مجھ سے کیوں چھپا رہی ہے۔؟"

"ننہیال گئے ہوئے ہیں ــ شاید رات لوٹ آئیں ــ ان کا باپ انہیں اپنے ساتھ لانے کے لیے گیا ہوا ہے۔!"

ویراں اُٹھنے لگی تو جگدیپ نے اس کا بازو پکڑ لیا "کیا باتیں کرکے پیٹ بھر گیا؟"

"فدا چرے کی خبر نو توں ــ کیا تو باتوں سے روٹی کھائے گا؟"

"روٹی تو روز کھانے کو مل جاتی ہے ــ یہ تیری باتیں نہیں مل سکیں گی۔"

جگدیپ ہنسنے لگا ــ ویراں کو خوش دیکھ کر وہ بھی آج بہت خوش تھا وہ کچھ اس طرح خوش تھا جیسے کوئی اپنی بیٹی اور بہن کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

"وہاں میرے پاس آکر بیٹھ جا ــ مونڈھا بچھائے دیتی ہوں ــ" ویراں نے چوکے میں مونڈھا ڈال دیا اور جگدیپ کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ خود دہلیز میں بیٹھ کر دال

کی چھٹائی کرنے لگی۔

ویراں نے دال چولھے پر رکھ دی ـــــ آلو بھونے ـــــ میٹھی سویاں بنائیں اور ساتھ ہی ساتھ چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہی۔

"کیا تو مجھے اپنی شادی پر بلائے گا ـــــ شہر کی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں ـ؟ ان کو کہیں زیادہ غرور تو نہیں ہوتا ـــــ؟ تیری چچی کہہ رہی تھی کہ تجھے ولایت جانا ہے ـــــ وہاں سے کوئی میم نہ لے آنا۔"

جگدیپ ہنستا رہا ـــــ کبھی اس کی کسی بات کا جواب دیدیتا اور کبھی خاموش رہتا ـــــ توے پر سے پراٹھے اُتار کر ویراں نے جگدیپ کے لیے کھانا پروس دیا۔

"پہلے سب کا انتظار کرلیں ـــــ پھر اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔"

"نہ جانے وہ کب آئیں ـــــ اور پھر میری ماں انہیں کھانا کھلا کر ہی بھیجے گی انہیں یونہی نہیں آنے دے گی۔"

"اچھا تو پکالے ـــــ میں اور تو ساتھ بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔"

"ارے ـــــ گرم گرم روٹی کھالے۔

"اونہہ ہوں۔"

ویراں نے شکست مان لی ـــــ جب اس نے چار پانچ پراٹھے پکالیے تو وہ بولی ـــــ "اماں اور بیٹا مل کر روٹی کھائیں۔"

جگدیپ نے نوالہ توڑتے ہوئے کہا ـــــ "پہلے مجھے یہ بتا کہ تو میری ماں ہے، بہن ہے کہ بیٹی ہے ـ؟"

"میں تیری سب کچھ ہوں ـــــ" ویراں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ـــــ

رات کا ہلکا سا دھندلکا پھیل چکا تھا جب ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا۔ ویراں کے دونوں بچے اور ان بچوں کا باپ آپہنچے تھے۔

"ذرا بتاؤ تو سہی ــــ ہمارے گھر کون آیا ہے ؟"

"میں بتاؤں ــــ ؟" بھگت رام کی آواز آئی۔

"تم بتا ہی نہیں سکتے "

" اگر بتا دوں تو ــــ "

"ایک ایک روپے کی شرط "

"لاؤ روپیہ نکالو "

"میں کیوں نکالوں ــــ تم نکالو "

"تجھے دینا ہوگا۔ اور دودھ میں دھو کر دینا ہوگا ــــ "

" اچھا دو دو روپے کی شرط رہی ــــ "

"جگدیپ آیا ہے "

"تمہیں کس نے بتایا ــ ؟" ویراں نے حیران ہو کر پوچھا۔

" اگر جگدیپ نہ ہوتا تو شرط ہی کیوں لگاتی ــــ " بھگت رام نے ہنستے ہوئے کہا جگدیپ چارپائی پر سے اٹھ بیٹھا ــــ بھگت رام اس سے یوں بغل گیر ہوا۔ جیسے مدت کے بچھڑے ہوئے دوست ملتے ہیں۔

دونوں بچے جگدیپ کی طرف چپ کھڑے دیکھ رہے تھے ــــ باری باری جگدیپ نے ان کو اپنی گود میں اٹھا لیا۔

" ان سے تو میری اب دوستی ہو جائے گی ــــ " جگدیپ نے کہا اور کشمیر سے

لایا ہوا پھلوں کا بکس کھولنے لگا۔

بھگت رام سے جب تک ملاقات نہیں ہوئی تھی جگدیپ کے دل میں ذرا سی جھجک تھی لیکن بھگت رام کی ہر ایک بات سے اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اس کا پرانا دوست ہو ــــ بھگت رام نے اپنے ہاتھوں سے خریدی ہوئی زمین اور فصلوں کی بات اس انداز سے چھیڑی جگدیپ کو بار بار یہ خیال آتا انسان کا دل سیر ہو تو وہ کیا کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا۔

سرخ آلو بخارے کھاتے ہوئے بچے جگدیپ کے ساتھ یوں باتیں کر رہے تھے جیسے اس کے ساتھ ان کی پرانی جان پہچان ہو۔

دوسرے دن صبح کو جگدیپ کو وہاں سے روانہ ہونا تھا لیکن جب ویراں نے اس کا بازو پکڑ کر اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کر اس سے کہا ــــ آج کا دن اور رک جاؤ ــــ پھر جیتے جی نہ جانے کب ملاقات ہو ــــ تو جگدیپ انکار نہ کر سکا۔

دوسرے دن جگدیپ روانہ ہوا تو اس نے ویراں کو اپنی آغوش میں لیکر پیار کیا ــــ وہ کچھ اس طرح خوش تھا جیسے کوئی اپنی بہن اور بیٹی کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔

جگدیپ نے دِلّی آکر سب سے پہلی جو تصویر بنائی وہ سرو کے پیڑ کے نیچے کھڑی ہوئی ریکھا کی تھی ــــ وہ سُوئی دھاگا لیکر پیڑ کے سبز دانوں کی مالا پرو رہی تھی ــــ تصویر میں اس نے ریکھا کا چہرہ زیادہ تر پتوں کی اوٹ میں دکھایا تھا ــــ وہ جانتا تھا کہ لوگ جب چہروں کو پہچان لیتے ہیں تو اُن کی آنکھوں میں کانٹے اُگ آتے ہیں اور جب وہ دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھتے ہیں تو جیسے کانٹے چبھوتے ہیں وہ ریکھا کے چہرے پر کسی کی نگاہ نہیں پڑنے دینا چاہتا تھا۔

زرد پھولوں کے پیڑ کے نیچے کھڑے ہوئے دو بُت بنائے جن کے قدموں تلے پھولوں کا فرش تھا اور جن کے سر پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔

ایک تصویر میں جگدیپ نے بادلوں کی طرح اندھیروں کے جھرمٹ بنائے اور روشنی کی ایک مہین اور باریک لکیر بنائی جو اندھیروں کی گھنی تہوں کو چیر رہی تھی۔ اس کے نیچے جگدیپ نے نہایت پتلی سطر لکھی:

"لاکھ اندھیرے پار کرتی چیرتی، آ رہی ہے روشنی کی ایک لکیر"

جگدیپ تصویریں بناتا جا رہا تھا اور اس کا سوال عظیم ہوتا جا رہا تھا ــــ

اسے محسوس ہوتا کہ روشنی کی لکیر نے ظلم ڈھایا تھا ـــــ اس نے اس پہ یہ بات عیاں کی تھی کہ اس کے اندھیرے کتنے گہرے اور بیکراں تھے ـــــ روشنی کی یہ لکیر کچھ ایسی تھی جیسے ہر لمحہ کسی کی کمی یا کوتاہی کی طرف انگلی سے اشارہ کر رہی ہو۔

نمائش گیلری کے منتظمین نے اسے خط لکھا کہ وہ اس کی تصویروں کی نمائش منعقد کر رہے ہیں ـــــ ساتھ ہی ساتھ اسے خبروں کی فلم بنانے والوں نے لکھا کہ وہ اگلے ہفتہ اس کے سٹوڈیو میں آ کر فلم تیار کریں گے ـــــ اپنی سب سے پسندیدہ تصویر کو آگے رکھ کر اگر وہ مصور کی فلم بھی لے رکھیں تو یہ ایک نہایت اچھی بات ہو گی۔

جگدیپ کو جب بھی اپنی پسندیدہ تصویر کا انتخاب کرنا ہوتا وہ بہت سی تصویریں اپنے سامنے رکھ لیتا اور اس کی نگاہ ایک ہی جگہ جا کر ٹھہر جاتی ـــــ ستاروں کی پوشاک پہن کر ایک خواب کی طرح کھڑی ہوئی نوراں۔

جگدیپ کی زندگی میں یہ تیسرا موقع تھا جب اس نے سوچا کہ وہ اس تصویر کو دوبارہ بنائے۔

ہر آنے والے برس پر اسے یوں معلوم ہوتا جیسے وہ گذشتہ برس جتنا اچھا فنکار نہیں تھا ـــــ اپنی پہلی تخلیقات کے متعلق اس کا اطمینان اطمینان نہ رہتا ـــــ فن اسے اپنے ہاتھ کے اشارہ سے اپنے پاس بلاتا ـــــ وہ آگے بڑھتا مگر فن اس سے بھی آگے بڑھ جاتی۔

اب کے جب جگدیپ نے نئی تصویر بنائی تو نوراں کے بھولے اور معصوم خدو خال میں دیکھا کے چہرے کی متانت بھی سرایت کر گئی ـــــ ایک دیوی جیسے اس پر اپنا سایہ ڈال رہی ہو۔ نوراں اور دیکھا مل کر ایک ہو گئی تھیں ـــــ جگدیپ ان میں

امتیاز نہیں کر سکتا تھا۔

فلم تیار کی گئی ۔۔۔ جگدیپ کے سٹوڈیو کی دیواروں سے لٹکی ہوئی ۔۔۔ تصویروں اور کینوس پر کام کرتے ہوئے فن کار کی فلم ۔۔۔ کام کرتے ہوئے مصور کی انہوں نے تصویر کھینچی تو اس میں کینوس پر مصور کے ہاتھ کو سامنے رکھا مصور کو نہیں ۔۔۔ اس تصویر میں جگدیپ کی پیٹھ نظر آ رہی تھی ۔۔۔ عقب میں اونچی جگہ کیمرہ رکھ کر یہ تصویر اتاری گئی تھی۔

بیچارے لوگ ۔۔۔ دل کی دیوار پر اپنا نام نہیں کندہ کر سکتے ۔۔۔ زمانہ کی دیوار پر اپنا نام ثبت نہیں کر سکتے ۔۔۔ جھوٹی تسلیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں ۔۔۔" ریکھا کے یہ الفاظ جگدیپ کو یاد آ گئے ۔۔۔ آج کی فلم میں اسے ایک بات اچھی لگی ۔۔۔ فلم میں اس کا چہرہ سامنے نہیں تھا۔ اس کا فن سامنے تھا۔ نوراں اور ریکھا کا چہرہ ۔۔۔ جیسے زمانہ کی دیوار پر ان کا نام کندہ ہو گیا ہو۔

جگدیپ اپنے کاموں کو جوں جوں پھیلاتا جا رہا تھا اس کے دل کی ویرانی گھنی ہوتی جا رہی تھی ۔۔۔ بعض اوقات ریکھا کے یہ الفاظ اس کے جگر کے پار ہو جاتے ہیں "کبھی کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے جب آپ کی تخلیق آپ کا مذاق اڑاتی ہے"

لوگ جگدیپ سے کہا کرتے تھے کہ تیری قسمت کی ریکھا بہت روشن ہے ورنہ جیتے جی فن کاروں کو کون پوچھتا ہے ۔۔۔" جگدیپ کے دل میں ایک جملہ ہلچل پیدا کر دیتا ۔۔۔ اس کی ہتھیلی پر کوئی ریکھا کیوں نہیں تھی ۔۔۔ ریکھا کی ریکھا ۔۔۔ اور اسے اپنی ہتھیلی بالکل خالی نظر آتی۔

دوسرے دن صبح کو نو بجے نمائش کی افتتاحی تقریب تھی ۔۔۔ اس رات جگدیپ

کا سٹوڈیو تصویروں سے خالی تھا ــــ سب ہی تصویریں نمائش کی گیلری میں لیجائی گئی تھیں تاکہ لوگ ان کے دام لگائیں۔

خالی سٹوڈیو میں بیٹھے ہوئے جگدیپ کو یوں معلوم ہوا جیسے اس کے ارد گرد ایک سنسان ویرانی تھی ــــ بھیانک ویرانی ــــ اور پھر اس ویرانی میں سوچ کی ایک لہر اٹھی ــــ دوسری پھر تیسری ــــ چاروں طرف جل تھل ہو گیا۔

جگدیپ کے پاؤں اکھڑ گئے ــــ کوئی لہر اسے دھکیل کر ادھر لے جاتی اور کوئی ادھر ــــ اس کا حال ان لہروں کے رحم و کرم پر تھا۔

اندھیرا بڑھتا گیا ــــ لہریں اور بھی بلند اور بھی سیاہ اور بھی ڈراؤنی ہوتی گئیں۔ جگدیپ کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی آخری گھڑی آ پہنچی ہو ــــ اس نے اپنا سب کچھ ان لہروں کے حوالے کر دیا ــــ اس کا سارا جسم لہروں کے تھپیڑوں سے ہانپنے لگا۔

پھر ایک جل پری نے ان لہروں کو ریزہ ریزہ کر دیا ــــ اس کے پیروں میں پڑے ہوئے گھنگرو بج اٹھے ــــ اس کے سارے جسم پر پانی کے قطروں کی پوشاک تھی جس میں سے اس کے سیپیوں کی طرح سفید اور چمکدار جسم کی آنچ آ رہی تھی۔ اس نے جگدیپ کو اپنی باہوں میں لے لیا ــــ لہروں کے تھپیڑے نرم پڑ گئے ــــ پھولوں کی پتیوں کی طرح نرم اور ملائم اور وہ جل پری کی باہوں میں پتیوں پر پڑی ہوئی شبنم کی طرح تھا۔

جل پری نے اپنے ہونٹوں کو جھکایا ــــ مزید جھکایا ــــ جگدیپ کو یوں لگا کہ اس کے ہونٹوں کو نرم اور ٹھنڈے ہونٹ چھو رہے تھے۔

"کیا تم خوش نہیں ہو ــــ" جل پری کی آواز آئی۔

"تم کون ہو"

"میں تمہیں پیار کرتی ہوں"

"مجھے ـــــ" "ہاں ـــــ"

"تم نوراں تو نہیں ہو ـــــ؟"

"نہیں ـــــ میں نوراں نہیں ہوں ـــــ"

"تم دیکھا بھی نہیں ـــــ"

"نہیں میں دیکھا بھی نہیں ـــــ"

"پھر کون ہو ـــــ؟"

"میں تمہیں پیار کرتی ہوں"

"میں نے تمہیں کبھی دیکھا ہی نہیں ـــــ"

"مجھے اسی بات کا تو دُکھ ہے تم میری طرف دیکھتے ہی نہیں ـــــ"

"تم کہاں رہتی ہو"

"تیرے چاروں طرف ـــــ"

"جھُوٹ ـــــ"

"تم مجھے ایک حقیقت کیوں نہیں مانتے"

"میں صبح کو تمہارے ساتھ ہوں گی ـــــ"

"صبح کو ـــــ"

"صبح کے نو بجے ـــــ"

"کل صبح تو میری تصویروں کی نمائش دکھائی جا رہی ہے"

"ہمارے دیش کا سب سے بڑا آدمی اس نمائش کا اُگھاٹن کریگا ـــ میں خوشبو کی طرح تمہارے ارد گرد پھیل جاؤں گی"

"خوشبو ـــ"

"تم ایک پھول ہو ـــ اور میں تمہاری مہک ہوں"

"تمہارا نام کیا ہے ـــ؟"

"شہرت"

"شہرت ـــ؟"

"میں تمہیں دنیا کا وردان کر ملی ہوں"

"وردان ـــ"

"تم مجھے دیکھتے ہی نہیں ـــ کتنے ہی فن کار ریاضت کرتے ہوئے مر جاتے ہیں۔

"میں ان سے کبھی نہیں ملتی ـــ"

"لیکن میں نے تو کوئی وردان نہیں مانگا تھا ـــ"

"جو لوگ میرے پیچھے دوڑتے ہیں میں ان کو کبھی نہیں ملتی ـــ میں تمہیں اسی لیے ملی ہوں کہ تم نے مجھے مانگا نہیں تھا ـــ"

"اور میں نے جو کچھ مانگا تھا ـــ؟"

"تم نے کیا مانگا تھا ـــ؟"

"تم نے ابھی ابھی کہا تھا کہ میں ایک پھول ہوں"

"ہاں ـــ؟"

"میں نے مانگا تھا کہ کوئی مجھے توڑ لے ـــ مجھے اپنے بالوں میں گوندے اور

میں اس کے بالوں سے چمٹا ہوا ختم ہو جاؤں۔"

"جانتے ہو پھر کیا ہوتا ——؟"

"کیا ہوتا ——؟"

"اس کی جھلک صرف ایک —— صرف ایک انسان کو آتی ——!"

"ہاں ——"

"لیکن اب تمہاری مہک سارے باغ میں ساری دنیا میں پھیلے گی۔"

"مگر مجھے کیا ملے گا۔؟"

"نیک نامی۔"

"یہ وردان واپس لے جاؤ ——"

"نہیں ——"

"یہ وردان ایک پتھر ہے جو میری زندگی سے اٹھایا نہیں جاتا۔"

"زندگی زیادہ دن تو نہیں رہتی —— چالیس —— زیادہ سے زیادہ پچاس سال —— ساٹھ برس —— لیکن میں ابد تک تمہارے ساتھ وابستہ ہوں گی"

"جب میں نہیں ہوں گا تو پھر میں اپنے نام کو کیا کروں گا —— میں تمام عمر تمہارا بوجھ اٹھاتا مر جاؤں گا۔"

"تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتا —— میں تم پر مہربان ہوں —— تمہارا وردان ہوں ——"

"وردان نہیں شراپ ——"

اور جگدیپ نے جل پری کی باہوں کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی

کوشش کی۔

جب وہ اپنے بازوؤں کا پورا زور لگا رہا تھا اس کی آنکھ کھل گئی۔ صبح کی روشنی کھڑکی سے گزر اس کے کمرے میں پھیل چکی تھی —— جگدیپ نے ایک نگاہ اپنے کمرے میں دوڑائی —— کمرہ تصویروں سے خالی تھا —— اس کے دل سے ایک ٹیس اٹھی —— "آج اس کی تخلیقات بھی اسے تنہا چھوڑ کر لوگوں کے پاس اپنی قیمت لگوانے چلی گئی تھیں۔

پریم نے جگدیپ کو دیکھا تو وہ حیران رہ گیا۔

"آٹھ بج چلے ہیں جگدیپ ___"

"اچھا ___!"

"تمہارا نوکر دو بار تمہاری چائے لایا تھا ___ پڑی پڑی ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور تم پیتے ہی نہیں ___"

"پی لوں گا"

"نو بجے سے دس منٹ پہلے ہی ہمیں وہاں پہنچنا ہے"

"اچھا"

"لوگ تم پر رشک کر رہے ہیں"

"کیوں ___؟"

"کیا یہ پوچھنے کی بات ہے ___؟ تمہاری جو عمر ہے اس میں کیا کسی فن کار کو اتنی شہرت نصیب ہوئی ہے ___ شہرت جیسی ___ شہر کے تمام مصور تمہارا نام سن کر جل بھن رہے ہیں"۔

پریم نے زبردستی جگدیپ کا بازو پکڑ لیا اور تولیا اس کے ہاتھ میں تھما کر اسے غسل خانے کی طرف بھیج دیا۔

نو بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے جب جگدیپ کو ساتھ لیکر پریم نمائش کی گیلری میں پہنچا ___ فوٹوگرافروں کے کیمروں میں بلب بار بار جل اٹھتا تھا اور بجھ جاتا تھا ___ جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک ایک کر کے تارے اس کے

آسمان پر نکل رہے تھے اور ٹوٹتے جا رہے تھے۔

ملک کے ہر دل عزیز وزیر کو دیکھنے کے لیے جگدیپ کے دل میں مدت سے ایک خواہش انگڑائی لے رہی تھی — آج وہ ہر دلعزیز وزیر اس کی تصویروں کی نمائش کا اُدگھاٹن کرنے کے لیے آیا تھا — اس نے جگدیپ کے گرد اپنا بازو ڈال کر اسے اپنے پہلو سے چپٹا لیا اور پھر نمائش کی گیلری کے دروازے پر لگے ہوئے ربن کو کاٹ دیا —

جگدیپ کو ایک بار تو یوں محسوس ہوا جیسے اِس کا آسمان بے پناہ روشنی سے جگمگا اٹھا ہو۔ دوسرے لمحہ ہی وہ سورج ڈھل گیا اور آسمان پہلے سے بھی زیادہ تاریک ہو گیا،

گیلری میں تِل دھرنے کو جگہ نہ رہی — کسی کی آنکھیں ایک تصویر پر جمی ہوئی تھیں تو دوسرے کی کسی اور تصویر پر۔

"جگدیپ —" ایک دبی ہوئی آواز سنائی دی۔

"ریکھا —" جگدیپ نے دیکھا ریکھا اس کے کندھے کے پاس کھڑی ہوئی اسے آواز دے رہی تھی۔

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ریکھا —" جگدیپ سے دیکھا نہ گیا۔

ریکھا کا چہرہ نہ جانے کون سے مرض سے نچڑ گیا تھا — سیاہ رنگ کا شال اس نے لپیٹ رکھا تھا اور لڑکی نے اسے بانہوں کا سہارا دے رکھا تھا۔

"انہیں ایک برس سے بخار آ رہا ہے۔ آج بھی ان میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی لیکن آنے پر بضد تھیں —" ریکھا کی سہیلی نے کہا۔

جگدیپ سے کچھ کہا نہ گیا۔

میں آج بہت خوش ہوں جگدیپ — میں آج کا دن دیکھنے کی بہت مشتاق تھی۔ میرے ساتھ چل کر مجھے اپنی تمام تصویریں دکھاؤ۔

جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے آنسوؤں نے اس کی آنکھیں بند کر دی تھیں اور اس کے ہونٹوں میں جنبش کی سکت نہیں تھی۔

"یہ زرد پھولوں والا درخت —— یہ تصویر کب بنائی تھی —؟" ریکھا آہستہ آہستہ چلتی رہی اور تصویریں دیکھتی رہی۔

"یہ ہاؤس بوٹ — یہ بارہ دری کی کھڑکی — یہ تصویر بہت پیاری ہے جگدیپ —— تاریکیوں کی تصویر —— تاریکی کی کیسے تہہ پر تہہ چڑھی ہوئی ہے ——" تصویر کے نیچے ریکھا نے پڑھا۔

لاکھ اندھیرے پار کرتی چیرتی
آ رہی ہے روشنی کی اک لکیر

یہ اس کا اپنا شعر تھا۔

اپنے شال کے پلّو سے ریکھا نے ایک بار اپنی آنکھیں پونچھیں۔

سامنے "سپنا" عنوان کی تصویر لٹکی ہوئی تھی —— ستاروں والی پوشاک پہن کر کھڑی ہوئی ایک دوشیزہ۔

"کیا یہ وہ تصویر تو نہیں جو اچھا بل میں تمہارے کمرے کے اندر ٹنگی ہوئی تھی"؟

"نہیں —— دوبارہ بنائی ہے"۔

نہ ریکھا قدم اٹھا سکی نہ جگدیپ —— اور پھر جگدیپ نے آہستہ سے کہا —!

"کیا آپ کو اس میں کوئی فرق نظر آتا ہے۔؟"

"ہاں ——"

"بھلا کیا —؟"

"آپ نے جیسے ایک چہرے میں دوسرا چہرہ سمو دیا ہو"

ایک بار تو جگدیپ کو یوں لگا جیسے اس کا تیر نشانے پر بیٹھا ہو ___ ریکھا نے فوراً کے چہرے میں جذب اپنا چہرہ پہچان لیا تھا ___ دوسرے ہی لمحہ جگدیپ کے دل میں ایک سوال نے سر اُبھارا ___ "کیسا نشانہ ___ کیسی جگہ ___ اسی ضرب کے لیے ریکھا کے پاس کونسی جگہ ___ اور زندگی کے پاس کونسی جگہ ہے ۔؟"

اگلی تصویر سرو کے پیڑ کے پاس کھڑی سبز دانوں کی مالا پروتی ہوئی ایک دوشیزہ کی تھی۔"

"سرو کے دانے ___" ریکھا نے کہا۔

مالا تو میں نے خود پروئی تھی ___ آپ نے نہیں ___ جگدیپ نے غمزدہ ہو کر کہا۔

ریکھا نے بڑی دیر تک کوئی جواب نہ دیا ___ اور پھر آہستہ سے کہا ___ تیرے پاس مالا پرونے کے لیے ہاتھ ہی کہاں تھے "۔

ریکھا سے کھڑا نہ رہا گیا ___ اس نے دیوار کا سہارا لیا ___ ریکھا کی سہیلی نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا ___ "آؤ واپس چلیں ___ تکلیف بڑھ جائے گی"۔

"کہاں جانا ہے ___؟"

"مَیں یہیں دِلّی میں ہوں "۔

"کب سے ۔؟"

"چار مہینے ہو چکے ہیں "۔

"چار مہینے ___؟"

"وہ کہتے تھے یہاں اچھے ڈاکٹر ہیں "۔

"مجھے اپنا پتہ کیوں نہ دیا ___؟"

ریکھا نے کافی دیر تک چپ رہنے کے بعد کہا ___ "میں سوچتی تھی کہ آپ مجھے بیماری کی حالت میں نہ دیکھیں تو اچھا ہے "۔

"پاگل ــــ" جگدیپ کے منہ سے نکل گیا۔

سہیلی نے ریکھا کا بازو پکڑ لیا اور اسے وہاں سے چلنے کے لیے پھر زور دیا۔

"کیا میں آپ کے ساتھ چلوں ــ؟" جگدیپ نے پوچھا۔

"نہیں ــــ آپ کو یہیں رہنا چاہیئے ــــ یہ تمام لوگ آپ ہی کے لیے تو یہاں آئے ہوئے ہیں۔"

"مجھے یہاں کیا کرنا ہے ــــ تصویریں لگی ہوئی ہیں ــــ لوگ دیکھتے رہیں گے۔"

جگدیپ نے ریکھا کی طرف اس طرح دیکھا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے دنیا میں ایک لمحہ کے لیے زندگی بسر کر لی ہو ــــ!

ریکھا کی سہیلی نے اسے اپنے بازوؤں کا سہارا دیے رکھا اور ریکھا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی باہر کے دروازے کے پاس آ گئی ــــ جگدیپ اس کے ساتھ تھا۔

"میں نے آپ کی ایک تصویر تو پہلے بھی دیکھی تھی لیکن آج ساری کی ساری دیکھ لی ہیں ــــ" ریکھا کی سہیلی نے جگدیپ سے کہا۔

"ایک تصویر پہلے دیکھی تھی ــــ کب ــــ؟"

"میرے ساتھ چلو گے ــــ؟" ریکھا نے آہستہ سے کہا۔

ریکھا کی سہیلی نے ریکھا کی طرف ہاتھ کا اشارہ کیا اور جگدیپ سے کہا ــــ "ریکھا بھی تو ایک تصویر ہے ــــ اور تمہاری ہے ــــ"

جگدیپ کو یوں محسوس ہوا جیسے دنیا کی سب سے بہتر تصویر پر کسی نے اس کا نام لکھ دیا ہو۔

اس نے ریکھا کو آہستہ سے اپنے پہلو کے ساتھ لگا لیا۔

اس روز جگدیپ جب ریکھا کو چھوڑ کر اپنے گھر لوٹ رہا تھا تو راستہ میں بارش آگئی — مینہ کی بوچھاڑ کچھ اتنی تیز تھی چار قدم چلنا بھی محال ہو گیا۔ سڑک سے گزرتے ہوئے لوگوں نے پاس کی دکانوں کے برآمدوں میں جا کر پناہ لی — لیکن جس جگہ جگدیپ موجود تھا۔ وہاں آس پاس کوئی برآمدہ نہیں تھا — ایک پیڑ تھا — جگدیپ اس کے نیچے جا کھڑا ہوا — بارش تھی کہ ایک بہت بڑا طوفان تھا — درخت کے نیچے کھڑا ہوا جگدیپ بارش سے شرابور ہو گیا — سردیوں کے دن تھے — اس کا بدن کانپنے لگا — نزدیک کوئی جائے پناہ نہیں تھی — سڑک پر سے کچھ کاریں گذر رہی تھیں — جہاں جگدیپ کھڑا تھا وہاں سے بائیں طرف سڑک کا چوک تھا — سامنے کچھ کاریں رک گئیں — کانسٹیبل کا ہاتھ دوسری طرف تھا اور جن لوگوں کی کاریں رک گئی تھیں وہ اپنی طرف ہاتھ کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔ سامنے سرخ رنگ کی ایک کار میں جگدیپ نے دیکھا رمندر بیٹھی ہوئی تھی — اگلی نشست پر — کار وہ خود چلا رہی تھی — ڈرائیور پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا — اسے دیکھے ہوئے کئی برس ہو چکے تھے مگر جگدیپ نے اسے پہچان لیا — اور پھر رمندر کی نگاہ بائیں طرف پڑی۔ پیڑ تلے — جہاں جگدیپ کھڑا تھا — رمندر نے چونک کر دیکھا — جگدیپ کو

اب اس بات میں شک نہ رہا ـــ رمندر نے بھی اسے پہچان لیا تھا ـــ ایک جھٹکے کے ساتھ رمندر نے اپنا منہ پھیر لیا ـــ کانسٹیبل نے ہاتھ سے اشارہ دیا اور رمندر نے تیزی کے ساتھ اپنی کار اس کے آگے سے گذار لی۔

مینہ میں شرابور اور سردی سے کانپتے ہوئے جگدیپ کو ہنسی آگئی ـــ اسے یاد آیا کہ رمندر کے ماڈل سے اُس نے جو پہلی تصویر بنائی تھی اس کا نام اُس نے "دنیا" رکھا تھا ـــ اس وقت اسے معلوم نہیں تھا دنیا کا برتاؤ کیسا ہوتا ہے" ـــ دنیا اسے خرید لینا چاہتی تھی ـــ اسے اپنا غلام بنا لینا چاہتی تھی ـــ اس کے "خواب" کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتی تھی ـــ پھر جگدیپ کو ایسا معلوم ہوا جیسے دنیا تاش کے پتوں کا ایک کھیل ہو ـــ رمندر ـــ رمندر ـــ تاش کے پتوں کا ایک کھیل اس کے پتے ہی چھوٹے تھے ـــ وہ کیا کر سکتا تھا ـــ کوئی بھی ذہانت اس کے چھوٹے پتوں کو بڑا نہیں کر سکتی تھی۔

پھر ایک خالی ٹیکسی گذری ـــ جگدیپ نے ہاتھ کا اشارہ کیا ـــ ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر آگیا۔

اس رات پریم نے اس سے آ کر کہا۔

"صبح تم نے یہ کیا کیا ـــ؟"

"کیوں ـــ کیا ہوا ـــ؟"

"تم نمائش کی گیلری سے چلے کیوں آئے ـــ؟"

"اس میں ایسی کون سی بات ہے"

"لوگ باتیں بنا رہے تھے"

"لوگوں کا اس بات سے کیا واسطہ ہے"

"تم نہیں سمجھتے جگدیپ ــــ لوگ تو کوئی بات چاہتے ہیں"

"وہاں لوگ کہاں تھے ــــ فن کار تھے یا فن کے پرکھنے والے ــــ میں چلا آیا ــــ انہیں مجھ سے کیا لینا تھا ــــ میرا فن تو وہیں تھا"

"اس دنیا میں فن کار ہوتے ہی کتنے ہیں ــــ؟ فن کے پرکھنے والے کتنے ہوتے ہیں ــــ؟ بار بار ریکھا کا نام لے رہے تھے"

"ریکھا کا"

وہ بھی تو تمہارے جتنی شہرت کی مالک ہے ــــ ویسے کسی نے دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو ــــ مگر تصویروں سے تو پہچان جاتے ہیں۔ کئی بار اخباروں میں اس کی تصویریں چھپ چکی ہیں"

"تو پھر کون سا گناہ ہو گیا ــــ ریکھا بیمار ہے ــــ آنٹی بیمار ہے کہ ــــ"

"لوگ کسی کے دکھ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے جگدیپ"

"آج مجھ سے کچھ نہ کہو پریم"

جگدیپ گھنٹہ بھر مینہ میں بھیگتا رہا تھا ــــ اسے ہلکا ہلکا بخار ہو گیا۔

پریم نے اسے برانڈی دی اور کمرے میں کوئلوں کی انگیٹھی جلا دی۔

پریم گزشتہ تین برس سے جگدیپ کے گھر ہی میں رہ رہا تھا ــــ تین برس ہو گئے تھے جب جگدیپ اپنے فلیٹ کے دو کمرے بند کر کے اور تیسرا کمرہ پریم کو دے کر دکن کی طرف چلا گیا تھا ــــ پریم تب سے وہیں رہ رہا تھا ــــ جگدیپ جب واپس آیا تھا تو اس وقت دلی میں مکان ملنے دشوار ہو گئے تھے ــــ ویسے بھی جگدیپ کو پریم اچھا لگتا

"تم ہو ریکھا ۔؟"

"یہ بخار کہاں سے لے آئے ۔؟"

"کچھ نہیں ریکھا ۔۔۔ مگر تم کیوں آئیں ۔؟"

"آج میری طبیعت ذرا اچھی تھی ۔۔۔ بہت ہی اچھی۔"

"اگر پھر خراب ہو گئی تو ۔؟"

"نہیں ہوتی ۔۔۔ آج نہیں ہوتی ۔۔۔ ریکھا صوفے پر بیٹھ گئی ۔

پریم شائد چائے بنانے کے لیے چلا گیا تھا ۔

"تم شاید بارش میں بہت بھیگ گئے ۔؟ ریکھا نے آہستہ سے کہا ۔

جگدیپ کو کل کی بارش یاد آ گئی ۔۔۔ اور پھر بارش میں بھیگتے اور سردی سے کانپتے ہوئے اس کے پاس سے رمندر کا منہ پھیر کر اور کار گزار کر کے جانا یاد آ گیا ۔۔۔ اسے خیال آیا ۔۔۔ جب کوئی دنیا کا غلام نہیں بنتا دنیا اس سے منہ موڑ لیتی ہے ۔۔! دنیا لاکھ منہ پھیرے ۔۔۔ میں اپنے سپنے کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہونے دوں گا ۔۔۔"

جگدیپ اندر اندر بل کھانے لگا ۔

"ایسی بارش روز ہو ۔۔۔" جگدیپ ہنس پڑا ۔

"اور روز بخار ہو جائے —"

"ہاں — اور روز کوئی خبر گیری کے لیے آئے۔"

"تم پتلون پہن کر کیوں سوئے ہوئے ہو — کیا اس طرح تکلیف نہیں ہوتی۔"

"نہیں دیکھا — میں ہمیشہ اسی طرح سویا کرتا ہوں۔

"پتلون پہن کر —" دیکھا جیسے حیران رہ گئی۔

جگدیپ ہنس پڑا — "میری ایک ذہنی پیچیدگی ہے دیکھا — میں پاجامہ پہن ہی نہیں سکتا — بالخصوص دھاری دار پاجامہ۔"

"کیسی ذہنی پیچیدگی —؟"

"قصہ سنا دوں —"

"نہ سنانے والی ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے۔"

"بات کوئی بڑی نہیں — لیکن اپنے پیچھے گہرا نشان چھوڑ گئی ہے۔ میں جب نیا نیا شہر میں آیا تھا تو اپنے سکول میں پاجامہ پہن کر گیا تھا۔ دھاری دار پاجامہ — مجھے معلوم نہیں تھا کہ شہر میں لوگ دھاری دار پاجامہ سونے سے پہلے پہنتے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا —" دیکھا ہنس پڑی۔

"مجھے یہ بات بتاتا کوئی نہیں تھا۔ لیکن سب ہی لڑکے میری طرف دیکھتے اور ہنستے ایک دن گزر گیا — دو دن گزر گئے — تین دن گزر گئے — لڑکے میری طرف یوں دیکھتے — میرا جی چاہتا میں اسکول سے بھاگ جاؤں —" جگدیپ ہنسنے لگا

میری ڈرائنگ اتنی اچھی تھی — میرے ماسٹر نے میری کاپی بورڈ سے لگا کر سب کو دکھائی۔ میری پیٹھ پر کچھ ایسی تھپکی دی کہ اس کے سامنے رو پڑا — اور اپنا دل

"تم ہو ریکھا ؟"

"یہ بخار کہاں سے آ گئے۔؟"

"کچھ نہیں ریکھا ــــ مگر تم کیوں آئیں۔؟"

"آج میری طبیعت ذرا اچھی تھی ــــ بہت ہی اچھی ہے"

"اگر پھر خراب ہو گئی تو۔؟"

"نہیں ہوتی ــــ آج نہیں ہوتی ــــ ریکھا صوفے پر بیٹھ گئی۔

پریم شائید چائے بنانے کے لیے چلا گیا تھا۔

"تم شاید بارش میں بہت بھیگ گئے۔؟ ریکھا نے آہستہ سے کہا۔

جگدیپ کو کل کی بارش یاد آ گئی ــــ اور پھر بارش میں بھیگتے اور سردی سے کانپتے ہوئے اس کے پاس سے رمندر کا منہ پھیر کر اور کار گزار کرکے جانا یاد آ گیا ــ اسے خیال آیا ــ جب کوئی دنیا کا غلام نہیں بنتا دنیا اس سے منہ موڑ لیتی ہے ــ! دنیا لاکھ منہ پھیرے ــــ میں اپنے سپنے کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہونے دوں گا ــــ"

جگدیپ اندر اندر بل کھانے لگا۔

"ایسی بارش روز ہو ــــ" جگدیپ ہنس پڑا۔

"اور روز بخار ہو جائے ۔"

"ہاں ـــــ اور روز کوئی خبر گیری کے لیے آئے ۔"

"تم پتلون پہن کر کیوں سوئے ہوئے ہو ـــــ کیا اس طرح تکلیف نہیں ہوتی ۔"

"نہیں دیکھا ـــــ میں ہمیشہ اسی طرح سویا کرتا ہوں ۔"

"پتلون پہن کر ـــــ" دیکھا جیسے حیران رہ گئی ۔

جگدیپ ہنس پڑا ـــــ "میری ایک ذہنی پیچیدگی ہے دیکھا ـــــ میں پاجامہ پہن ہی نہیں سکتا ـــــ بالخصوص دھاری دار پاجامہ ۔"

"کیسی ذہنی پیچیدگی ـــــ؟"

"قصہ سنا دوں ۔"

"نہ سنانے والی ایسی کون سی بات ہو سکتی ہے ۔"

"بات کوئی بڑی نہیں ـــــ لیکن اپنے پیچھے گہرا نشان چھوڑ گئی ہے ۔ میں جب نیا نیا شہر میں آیا تھا تو اپنے سکول میں پاجامہ پہن کر گیا تھا ۔ دھاری دار پاجامہ ـــــ مجھے معلوم نہیں تھا کہ شہر میں لوگ دھاری دار پاجامہ سونے سے پہلے پہنتے ہیں ۔"

"پھر کیا ہوا ـــــ" دیکھا ہنس پڑی ۔

"مجھے یہ بات بتاتا کوئی نہیں تھا ۔ لیکن سب ہی لڑکے میری طرف دیکھتے اور ہنستے ایک دن گزر گیا ـــــ دو دن گزر گئے ـــــ تین دن گزر گئے ـــــ لڑکے میری طرف یوں دیکھتے ـــــ میرا جی چاہتا میں اسکول سے بھاگ جاؤں ـــــ" جگدیپ ہنسنے لگا میری ڈرائنگ اتنی اچھی تھی ـــــ میرے ماسٹر نے میری کاپی بورڈ سے لٹکا کر سب کو دکھائی میری پیٹھ پر کچھ ایسی تھپکی دی کہ اس کے سامنے رو پڑا ـــــ اور اپنا دل

کھول کر رکھ دیا۔"

"اس نے بتایا ہوگا کہ ۔۔۔"

"ہاں ریکھا ۔۔۔ میں نے اگلے دن سے پاجامہ پہننا ہی چھوڑ دیا ۔۔۔ اور پھر اس کے بعد باہر تو کیا گھر میں بھی نہیں پہن سکا ۔۔۔ سوتے ہوئے بھی نہیں ۔۔۔ دھاری دار تو خیر پہننا ہی نہیں تھا سفید پاجامہ بھی نہیں پہن سکا۔"

ریکھا اتنے بڑے مصور کی اتنی بڑی ذہنی پیچیدگی پر کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔۔۔ اور اسے جگدیپ کے دل کی سادگی اس کے تمام فنون سے عظیم معلوم ہوئی ۔۔۔ اتنے میں پریم نے آکر کہا "ڈاکٹر آگیا ہے ۔۔۔!"

"تم نے کتنے ڈاکٹر بلوائے ہیں ۔۔۔؟" جگدیپ ہنس پڑا۔

"اب میں ایک نقلی ڈاکٹر لایا ہوں ۔۔۔" پریم بھی ہنس پڑا۔

ڈاکٹر نے آکر پانچ سات منٹ تک اسے دیکھا ۔۔۔ تھرما میٹر لگایا اور پھر ریکھا کی طرف منہ کر کے کہا ۔۔۔ "تین تین گھنٹوں کے بعد خوراک دیدیجیے گا ۔۔۔ اگر سر میں درد زیادہ ہو تو تھوڑی سی وِکس مل دیجیے گا۔"

"بہت اچھا ۔۔۔" ریکھا نے آہستہ سے کہا اور سر جھکا لیا۔

ڈاکٹر چلا گیا ۔۔۔ پریم بھی اس کے ساتھ دوا لانے چلا گیا ۔۔۔ جگدیپ نے دیکھا ریکھا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے ۔۔۔ دونوں نے کچھ کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکے ۔۔۔ جگدیپ نے ریکھا کا ہاتھ تھام لیا ۔۔۔ ریکھا نے اپنا سر مونڈھے سے لگا دیا ۔۔۔ آنسوؤں کے کتنے ہی قطرے ریکھا کے چہرے کو بھگو گئے۔

پریم نے پندرہ بیس منٹ کے بعد آکر دوا اور وِکس کی شیشی میز پر رکھ دی

اور ہنس کے ریکھا سے بولنے لگا —— تین تین گھنٹوں بعد خوراک دیتے رہیے گا — اگر سر میں درد زیادہ ہو تو تھوڑی سی وکس مل دیجیے گا۔"

ریکھا ہنس پڑی —

"تم کہاں جا رہے ہو —؟" جگدیپ نے تنک کر پریم سے کہا۔

"دفتر سے چھٹی نہیں ملی — دفتر جا رہا ہوں۔"

"چل ہٹ — بیٹھ جا یہاں —"

تینوں ہنس پڑے اور پریم ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

ریکھا نے جگدیپ کو دوا کی خوراک دے کر کہا —"سر میں درد زیادہ تو نہیں ہو رہا —؟"

جگدیپ —"نہیں" کہنے ہی والا تھا مگر اس کی ہنسی چھوٹ گئی اور وہ بولا۔

"سر میں سخت درد ہو رہا ہے۔"

ریکھا ہنس پڑی مگر اپنی نرم اور لمبی انگلیوں سے جگدیپ کی پیشانی پر وکس ملنے لگی۔

پریم نے نوکر سے جا کر کہا کہ وہ چائے تیار کر کے لے آئے — جب چائے آئی تو ریکھا سے چائے کی پیالی لے کر جگدیپ نے کہا — جس کی اتنی خاطر و مدارات ہو وہ بھلا اچھا کیوں ہونے لگا۔"

بیماری سے ریکھا کا رنگ کچھ سنولا گیا تھا — ریکھا کی باہوں سے جگدیپ نے اپنی باہیں ناپ کر کہا —"ان چاروں بازوؤں کا رنگ ایک سا ہے ریکھا — بتاؤ تمہاری کون سی ہیں اور میری کون سی —؟"

پہلے تو ریکھا کے جی میں یہ آیا کہ وہ کہہ دے "چار دن تمہارے ہیں۔" لیکن ریکھا کے چہرے پر اداسی کی ایک اور سانولی پرچھائیں پڑی اور اس نے اپنے دونوں بازوؤں کی طرف دیکھ کر کہا — "اب یہ بازو میرے نہیں ہیں —" اور پھر ایک سرد آہ بھر کر وہ جگدیپ کے بازوؤں کی طرف دیکھتی ہوئی بولی — "اور یہ بازو میرے بن نہیں سکتے۔"

جگدیپ ریکھا کی یہ افسردگی برداشت نہ کر سکا — اس نے اپنے بازو ریکھا کے بازوؤں پر لپیٹ دیئے۔

اور پھر جو بات ریکھا کہنے لگی تھی اس کے ہونٹوں پر آگئی — "چار دن تمہارے ہیں۔"

ریکھا کو وہاں آئے ہوئے تین گھنٹے ہو گئے تھے اور ریکھا کی سہیلی اسے ساتھ لے چلنے کے لیے آگئی۔

"ڈاکٹر دو بجے آئے گا انجکشن لگانے — اس کا فون آیا تھا اور اب ایک بج چکا ہے — سہیلی نے ریکھا سے کہا اور پھر جگدیپ کا حال پوچھنے لگی۔

"تم نے ڈاکٹر کو شام کا وقت دے دیا ہوتا —" ریکھا نے کہا۔

"میں نے بہت کہا مگر ڈاکٹر مانا ہی نہیں — اور پھر اس سے کہتی کیا کہ مریض گھر میں نہیں ہے —" سہیلی نے آہستہ سے ریکھا کا ہاتھ دبایا۔

[illegible] چھوٹی ٹیکسی لے آیا — ریکھا جب جانے لگی تو جگدیپ کو ایسا محسوس [illegible] زندگی [illegible] پہلی بار تین گھنٹوں کے لیے اس کا گھر آباد ہوا۔

ایک آدھ دن میں جگدیپ کا بخار اتر گیا ــــ اب وہ ہر روز دن میں ایک بار ریکھا کو جا کر دیکھ آتا تھا ــــ ریکھا کے گھر میں صرف اس کا پتی تھا۔ نوکر تھے اور سہیلی تھی ــــ سہیلی نے جیسے خود کو ریکھا کے لیے وقف کر دیا تھا ــــ اس کا خاوند آج کل لندن میں تھا اور اس نے اپنے خاوند کو لکھ دیا تھا کہ جب تک ریکھا بیمار ہے وہ اپنے گھر میں نہیں رہے گی ــــ ریکھا کے پاس رہے گی۔

زندگی میں جگدیپ کے پھر چلے آنے سے ریکھا کے چہرے پر رونق آگئی تھی جیسے زندگی نے اسے چند روز کی بھیک دیدی ہو۔ مگر زندگی اتنی مہربان نہیں تھی جتنا کہ سب نے سوچ رکھا تھا۔ ایک دن اچانک ہی ریکھا کو قے ہوئی ــــ قے میں خون تھا ــــ ڈاکٹر بھی نا امید ہو گیا۔

جب سے جگدیپ اپنی ماں سے محروم ہوا تھا تب سے اسے خدا پر یقین نہیں رہا تھا۔ جگدیپ کو محسوس ہوا تھا ــــ خدا کسی کا نہیں ــــ خدا بچوں کی بھی نہیں سنتا ــــ اس کے بعد اس نے خدا سے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

ــــ آج جگدیپ کی زندگی میں دوسری بار امتحان کی گھڑی آئی تھی ــــ اس کے دل کے درد نے خدا سے کہا ــــ آج تجھے پھر آزماؤں گا ــــ تو نے ایک بچے کے پاکیزہ دل کی لاج نہیں رکھی تھی ــــ آج محبت کے پاکیزہ اور مقدس دل کی لاج رکھے گا۔

یا نہیں ۔؟ ریکھا کو زندگی دیدے ـــــ میں دنیا میں کسی کا دل نہیں دکھاؤں گا ـــــ میں کبھی ریکھا کے خاوند کا بھی دل نہیں دکھاؤں گا۔"

ایک دن ریکھا میں پلنگ پر سے اٹھنے کی بھی سکت نہیں تھی مگر اس نے جگدیپ سے کہا ـــــ "میرا جی تمہارے سٹوڈیو میں جانے کو چاہتا ہے۔"

"اس حالت میں ـــ؟"

"نمائش ختم ہو گئی کیا ـ؟"

"کبھی کی۔"

"کیا تصویریں واپس آ گئی ہیں ـ؟"

"ہاں ـــ"

"میرا انہیں دیکھنے کو جی چاہتا ہے ـــــ سب ہی تصویریں دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔" زرد پھولوں والے پیڑ کی تصویر ـــــ ہاؤس بوٹ والی ـــــ سرو کے پیڑ والی ۔

"میں سب تصویریں یہاں لے آؤں گا۔"

"میرا جی چاہتا ہے کہ تم میرے سامنے بیٹھ کر ایک تصویر بناؤ۔"

"میں یہیں بنا دوں گا۔"

"نہیں ـــــ ایسے نہیں ـــــ یہاں تو میں چارپائی پہ پڑی ہوں ۔ تمہارے سٹوڈیو میں بیٹھ کر ـــ کیا تمہیں یاد ہے ایک بار تم نے مجھے ایک بات سنائی تھی۔"

"کون سی ـ؟"

"اپنے گاؤں کے مکان کی بالائی منزل میں بیٹھ کر تم نے نوراں کی تصویر بنائی تھی!"

"ہاں"

"اس نے ستاروں والی چنری اوڑھی ہوئی تھی ۔ میں بھی ستاروں والا دوپٹہ اوڑھونگی ۔

"ریکھا" جگدیپ کے آنسو اس کی آنکھوں میں لرزنے لگے ۔

دوسرے دن کشمیر میں بنائی ہوئی تمام تصویریں اپنے یہاں سے لاکر جگدیپ نے ریکھا کے کمرے میں لگا دیں ریکھا نے ان کی طرف بار بار دیکھا اور پھر کہا "کیا تمہیں یاد ہے" زرد رنگ کے پھولوں والے درخت کے نیچے بیٹھ کر تم نے یہ کہا تھا ۔؟"

"یاد ہے ریکھا"

"تم نے کہا تھا پھول گریں اور اتنے گریں میں ان کے نیچے دب جاؤں پھولوں کی قبر بن جائے اور میں قبر میں سو یا رہوں"

"آج زیادہ باتیں نہ کرو ریکھا تمہاری طبیعت اچھی نہیں"

"آج تم پھولوں سے کہو کہ وہ میری چارپائی پر گریں اور اتنے گریں کہ پھولوں کی قبر بن جائے"

جگدیپ نے اپنی ہتھیلی ریکھا کے ہونٹوں پر رکھ دی ۔

دیدی کوئی اخبار والا آیا ہے آپ کی مزاج پرسی کے لیے انٹرویو لینے آئے ہیں" ریکھا کی سہیلی نے آکر کہا ۔

ان سے کہہ دو کہ میں اس وقت پھولوں کی باتیں کر رہی ہوں —— دو کوڑی کی باتیں کرنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

ریکھا کی سہیلی سے اپنے آنسو نہ پیے گئے اور وہ اُلٹے پاؤں واپس چلی گئی ۔

دوسرے دن جگدیپ جب آیا تو اس نے ریکھا کے پلنگ کے پاس پڑی ہوئی میز پر پھولوں کا ڈھیر لگا دیا ریکھا نے کئی بار ان پھولوں سے اپنی مٹھیاں بھر لیں ۔ مٹھیاں بھر لیتی —— کھول دیتی اور پھر بھر لیتی ۔

"آج میں بہت خوش ہوں —— گذشتہ رات مجھ کو یہی محسوس ہوتا رہا جیسے میں دھنک کے پر کے نیچے سوئی پڑی ہوں —— میرے نیچے پھولوں کا فرش ہو اور میرے اوپر پھولوں کی چادر ہو —— !"

"کیا تمہیں وہ تصویر یاد ہے ریکھا ۔ سپنا ۔ ؟"

ہاں —— ستاروں کی پوشاک والی —— پہلے وہ صرف نوراں تھی پھر تم نے اس میں میری صورت بھی سمو دی تھی ۔"

"سرکار نے "نیشنل آرٹ گیلری" کے لیے مانگ لیا ہے ۔"

"اچھا تو زمانہ کی دیوار پر میرا نام بھی لکھا گیا ۔ !" ریکھا ہنس پڑی ——

مگر زندگی کی دیوار پر اپنا نام کوئی نہیں لکھ سکتا دیپ —— زمانے کی دیواروں کا کوئی کیا کرے —— ریکھا کی آنکھوں میں ڈبڈبا آئے ۔

جگدیپ سے کچھ نہ کہا گیا۔

تم نے ستاروں والے دوپٹہ کے ساتھ میری ایک تصویر بنائی ہے نا؟"

جگدیپ اپنی زبان سے کچھ نہ سکا۔ —— صرف سر کو جنبش دیتے ہوئے اس نے کہا " ہاں "

اس رات ریکھا کو خون آلود متلی آئی اور وہ بیہوش ہوگئی۔ —— دوسرے دن صبح کو جب جگدیپ آیا ریکھا بیہوش تھی اور اس کے ارد گرد ڈاکٹر ہی ڈاکٹر تھے۔

ریکھا کا سانس اکھڑ گیا —— جگدیپ کا دل تڑپ اٹھا۔ —— " آج میں نے خدا کو دوسری بار آزما لیا۔ —— وہ سچے دلوں کی بات سنتا ہے نہ پاکیزہ دلوں کی "

ریکھا کے سانس ختم ہو گئے —— جگدیپ کے چلتے ہوئے سانسوں میں جیسے جان نہ رہی ہو۔

جگدیپ کے دل پر کیا گذر رہی تھی اس کا حال صرف ریکھا کی سہیلی کو معلوم تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ تو رو سکتی تھی۔ دل کھول کر رو سکتی تھی مگر جگدیپ رو بھی نہیں سکتا تھا۔ —— وہ جگدیپ کے قریب آکر دھاڑیں مار کر رونے لگی۔

" ایک بات سنو —— " جگدیپ کے منہ سے نکلا۔

" ریکھا نے ستاروں والا دوپٹہ مانگا تھا —!"

" ہاں —"

" وہ لے دیدو "

جگدیپ سے جایا نہیں جاتا تھا۔ —— ریکھا کی سہیلی نے جگدیپ سے چابی لی اور اس کے گھر جا کر اس کا صندوق ٹٹول کر ستاروں والا دوپٹہ لے آئی —— جگدیپ کو

یوں لگا اپنی ماں نے جھانجریں اور دوپٹہ اس کے لیے دو امانتیں رکھی تھیں
جھانجریں اس کی شہرت نے پہن لی تھیں اور دوپٹہ آج ریکھا نے اوڑھ لیا تھا۔
"یہ دوپٹہ میں نے ایک مدت سے رکھا ہوا تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ
میں آخری وقت پر یہ دوپٹہ اسے اڑھا دوں۔"
ریکھا کی سہیلی نے ریکھا کے خاوند سے کہا اور ریکھا کے سر پہ دوپٹہ ڈالتے ہوئے
اسے یوں محسوس ہوا کہ آج اس نے جھوٹ بولا تھا لیکن اس سے بڑا سچ شاید کوئی تھا نہیں۔
اب اخباری نمائندوں کو کوئی روک نہیں سکتا تھا وہ اپنے قلم لے آئے۔
کیمرے لے آئے، جگدیپ ریکھا کے سر پر لپٹا ہوا ستاروں والا دوپٹہ دیکھ رہا تھا۔
کہ ریکھا کی سہیلی نے کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ جگدیپ کے ہاتھ میں دیدیا رات
کو جب ریکھا کی حالت خراب ہو گئی تھی تو اس نے دو شعر کہے تھے اور کہا تھا کہ تمہیں دیدوں۔
جگدیپ نے کاغذ کی تہہ کھولی۔ لکھا تھا۔

دل جھیل پہ سورج برات لے آیا!
کوئی کرن بھی قدم اس کے اٹھ کے لے نہ سکی
ہمارے عشق نے سادہ سا اک سوال کیا
کہ جس کا ساری خدائی جواب دے نہ سکی

وقت تھرتھراتا ہوا کہ جیسے اس سوال کو پڑھنے کے لیے کھڑا ہو گیا ہو۔ اور
پھر سر جھکا کر اپنے راستے پر ہو لیا۔ جیسے اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

میرے بہترین افسانے

منشی پریم چند

.... میرے دوست مدت سے
مصر تھے کہ میں اپنی کہانیوں کا ایک ایسا نمائندہ
مجموعہ منتخب کروں جس کے مطالعہ سے لوگ زندگی کے
متعلق میرے نظریات معلوم کر سکیں. یہ انتخاب اس مقصد
کو ملحوظ رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے. اس میں میں نے محض
اُن کہانیوں کو ہی چُنا ہے جنہیں میں خود پسند کرتا ہوں اور
جنہیں جُدا جُدا نوعیت کے نقادوں نے بھی
سراہا ہے: پریم چند

چودھری اکیڈمی گنپت روڈ لاہور